www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2025 ، قیمت :- 15 ₹

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

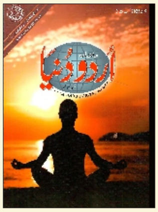

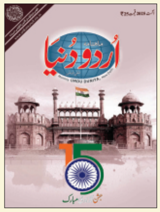

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 25 روپے، سالانہ: 240 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہم سے رابطہ کیجیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
مضامین		
برف کے گھر - اگلو	بانو سرتاج	07
کامیابی کا راز	محمود اختر جلالپوری	10
یونیسیف: بچوں کا بین الاقوامی فنڈ	سید واجد علی شاہ جیلانی	12
شخصیات		
مہاتما گاندھی: امن کے علم بردار	عبدالقدوس	14
گاندھی باپو	سیدہ فرحت	17
منشی پریم چند	نذیر فتح پوری	18
نظمیں		
دیوالی	نظیر اکبرآبادی	21
ایک پنجرہ اور دو طوطے	شاہد جمیل	22
باپو	مصباح الدین طارق	22
علم کے موتی چن لو	مناظر حسن شاہین	23
ایک کہانی	محمد عامر علوی	24
گھر ہوگا میرا بھی پیارا	ساحر داؤدنگری	25
سب سے پیارا بھارت ہے	پروانہ برہانپوری	26
مثالی ادارہ		
شانتی نکیتن ایک مثالی اسکول	صفدر حسین	27
ڈراما		
ننھی کاؤنسلر	انیس اعظمی	30
کہانیاں		
بجلی کا بل	اقبال برکی	33
حکمت اور دانائی	پرویز مانوس	38
والدین سے محبت	محمد الیاس	41
موبائل کی دنیا	روبینہ	44
ننھی تتلی کی ہمت	منصور خوشتر	48
ماحول کا محافظ	یاسمین بانو	50
ندی کا راز	عاطف عدنان شیخ صادق	53
سائنس		
ماہر فلکیات وکرم سارا بھائی	احرار حسین	56
واقفیت عامہ		
تاریخی، سائنسی اور ثقافتی معلومات	ادارہ	58
کہکشاں		
چمن چمن کے پھول		59
ننھے فنکار		
پینٹنگ		60

بچوں کی دنیا

جلد: 13 شمارہ: 10 اکتوبر 2025

مدیر: ڈاکٹر شمس اقبال

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم۔محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
شعبہ ادارت: 49539009-11
ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/15 روپے، سالانہ: -/145 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی-110066
فون: 26109746

ای میل: sales@ncpul.in

علاقائی مرکز: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

پیارے بچو! تعلیم سے جہالت دور ہوتی ہے، ذہن روشن ہوتا ہے اور اخلاق و کردار سنورتے ہیں۔ تعلیم ترقی اور کامیابی کی ضمانت ہے، اس سے انسان میں مہارت اور خود اعتمادی آتی ہے اور خواب حقیقت میں بدلتے ہیں۔ کتابیں اور رسائل انسان کے بہترین دوست ہیں جو نہ صرف آگے بڑھنے کی راہ دکھاتے ہیں بلکہ مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کا ہنر بھی سکھاتے ہیں۔ تعلیم سے مستقبل کے دروازے کھلتے ہیں اور انسانی سوچ کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ تعلیم انسان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتی ہے اور اچھے برے میں فرق کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن قوموں اور ملکوں نے تعلیم کو اپنایا کامیابی و کامرانی نے ان کے قدم چومے ہیں۔

پیارے بچو! تعلیم اور اسکول کا آپس میں بہت گہرا رشتہ ہے۔ اسکول کے اساتذہ طالب علم کو پڑھنے لکھنے اور سوچنے سمجھنے کے قابل بناتے ہیں اور ان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ اسکول صرف ایک تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ ایک ایسی درس گاہ ہے جہاں طالب علم کی شخصیت نکھرتی اور سنورتی ہے۔ ایک بچہ جب پہلی بار اسکول جاتا ہے تو وہ بہت سی چیزوں سے لاعلم ہوتا ہے لیکن اسکول کا ماحول اور وہاں کے اساتذہ اسے نصابی کتابوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی اچھی اور بری چیزوں سے بھی روشناس کراتے ہیں۔

بچو! اسکول کے بغیر تعلیم کا تصور ادھورا ہے۔ اسکول بچوں کی ہمہ جہت تربیت کا مرکز ہے، یہاں سچائی، ایمانداری، محنت، نظم وضبط اور بھائی چارے جیسی خوبیاں پروان چڑھتی ہیں۔ یہ خوبیاں آپ کو نہ صرف ایک طالب علم بناتی ہیں بلکہ ایک شاندار انسان بھی بناتی ہیں۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب معیاری تعلیم کے ساتھ مخلص اور قابل اساتذہ موجود ہوں، اسکول کا ماحول محفوظ اور خوش گوار ہو، جدید سہولتوں سے آراستہ ہو، تخلیقی اور تنقیدی سوچ کو فروغ دیا جائے، اخلاق اور کردار سازی پر خصوصی توجہ دی جائے، کمپیوٹر، سائنس لیب اور لائبریری جیسی سہولیات میسر ہوں، سب بچوں کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جائے اور ان میں ملک وقوم سے محبت اور سماجی خدمت کا جذبہ بیدار کیا جائے۔ یہی خوبیاں کسی بھی اسکول کو معیاری اور مثالی بناتی ہیں۔

پیارے بچو! 'بچوں کی دنیا' کے اکتوبر 2025 کے شمارے میں 'شانتی نکیتن کے مثالی اسکول' پر ایک مضمون شامل ہے اسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ مثالی اسکول کیسا ہوتا ہے۔ اکتوبر میں دیوالی کا تہوار بھی ملک بھر میں منایا جائے گا۔ اس مناسبت سے دیوالی پر ایک نظم بھی اس شمارے میں شامل کی جارہی ہے، دیوالی کا تہوار ہمیں کیا پیغام دیتا ہے اس نظم میں اسے خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ آپ اس شمارے کا مطالعہ کریں اور اپنی رائے خطوط یا ای میل کے ذریعے ہمیں ضرور بھیجیں۔

آپ کا

شمس اقبال

ڈاک خانہ

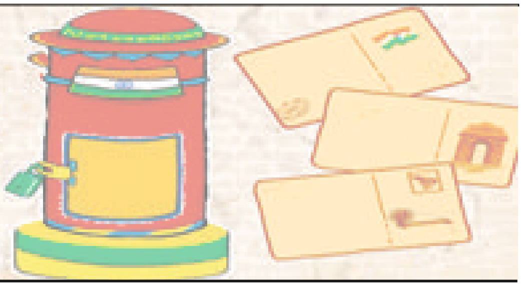

بچوں کی دنیا میرا محبوب رسالہ ہے، کیونکہ اس میں بچوں کے لیے سبق آموز کہانیاں، مضامین اور نظمیں وغیرہ ہوتی ہیں۔ اس رسالے میں شامل تمام تحریریں بچوں کی جانکاری اور علم میں اضافہ کررہی ہیں۔ کہانیوں اور نظموں کا انتخاب بڑی محنت اور عرق ریزی سے کیا گیا ہے۔ ستمبر 2025 کے اداریے میں 5 ستمبر یعنی یوم اساتذہ کی مناسبت سے اساتذہ کی اہمیت و افادیت پر جامع گفتگو کی گئی ہے۔ اس شمارے کی پہلی نظم 'ہمارے استاذ' میں استاد کی اہمیت، عزت اور مرتبے کو بڑے اچھے طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ محمد قمر سلیم کا مضمون 'استاد کے نام ایک خط' پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ استاد کی ڈانٹ، مثالی طالب علم اور نظم 'معلم کے دم سے ہے دنیا یہ روشن' یوم اساتذہ کی مناسبت سے عمدہ تحریریں ہیں جو مجھے خاص طور سے پسند آئی ہیں۔ سائنس اور طب پر جو تحریریں ہیں وہ بھی بہت اچھی ہیں۔ ڈرامائی انداز میں لکھا گیا 'سایہ جو سورج کو نگل گیا' سورج گرہن پر عمدہ اور جانکاری سے لبریز ڈرامہ ہے۔ جاوید احمد سعیدی کا مضمون ذیابیطس بھی علمی مضمون ہے، اس مضمون میں ذیابیطس ہونے کی وجوہات پر سائنسی تحقیق کے ساتھ آنکڑے بھی پیش کیے گئے ہیں اور ذیابیطس سے بچنے اور اس کے علاج پر اچھی جانکاری موجود ہے۔ اخیر میں 'تاریخی، سائنسی اور ثقافتی معلومات' کا صفحہ بہت کارآمد ہے۔ اس طرح کے جنرل نالج سے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے علم میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے ذہن بناتا ہوا یہ صفحہ بہت پسند آیا۔

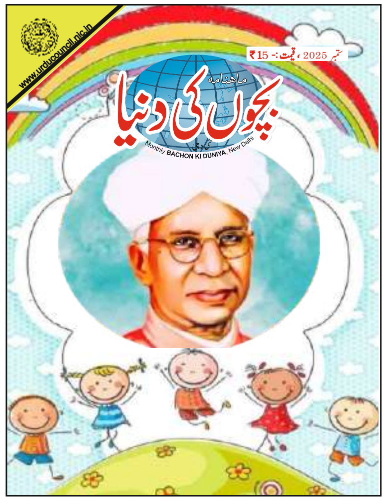

مسرور عالم، محلّہ آزادنگر، قصبہ تمبور، سیتاپور، یوپی

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' اگست 2025 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ٹائٹل پیج پر ماہر تعلیم، سابق صدر جمہوریہ سروپلی رادھا کرشنن کی خوبصورت تصویر لگی ہے۔ اداریے میں یوم اساتذہ کی مناسبت سے اساتذہ کی اہمیت و افادیت کو بیان کیا گیا ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ طالب علم کی ذہنی و اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی سوچ، کردار اور مستقبل کو سنوارنے میں بھی اساتذہ کا اہم رول ہوتا ہے۔ ہمارے ملک ہندستان میں 5 ستمبر کو یوم اساتذہ منایا جاتا ہے اسی مناسبت سے ستمبر کے شمارے میں یوم اساتذہ کے عنوان سے ایک گوشہ ہے جس کے تحت پانچ تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ 'ہمارے استاذ' کیف احمد صدیقی کی بہت ہی پیاری نظم ہے، اس نظم میں اساتذہ کی

اہمیت کو بڑے دلکش پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظم میں نے بھی پڑھی اور بچوں سے بھی کہا کہ وہ لوگ اسے بار بار پڑھیں تاکہ استاد کی اہمیت ان کے ذہن و دل میں بیٹھ جائے۔ نکہت انجم ناظم الدین کا مضمون مثالی طالب علم بھی اچھا مضمون ہے، اس میں ایک مثالی اور اچھے طالب علم کی خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے۔ نظموں کا انتخاب بھی خوب ہے، خاص طور پر عبدالرزاق دل کھولا پوری کی نظم 'مزیدار جامن' اور 'اصغر شمیم' کی تتلی بے حد پسند آئی، ان دونوں نظموں کو پڑھنے کے بعد میں اپنے بچپن کے دنوں میں کھو گیا اس لیے کہ جامن اور تتلی دونوں ہی مجھے بچپن میں بہت پسند تھے اور جامن تو آج بھی مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ کہانیوں میں 'دایاں کان'، 'ہمت نہ ہارنا' اور 'نئی راہ کی تلاش' اچھی لگی۔ اس کے علاوہ 'دنیا کا سب سے بڑا اور بدبودار پھول'، ذیابیطس' اور تاریخی، سائنسی اور ثقافتی معلومات' بھی بے حد معلوماتی تحریریں ہیں، بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کو بھی اسے ضرور پڑھنا چاہیے۔

شارق حسن، بنی پور، دربھنگہ، بہار

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' نہ صرف بچوں کو کتاب سے جوڑتا ہے بلکہ اُن کے دلوں کو اخلاق، محبت اور انسانیت کی روشنی سے منور کرتا ہے۔ اس کے ہر شمارے میں کہانیاں، نظمیں، کوئز، سائنسی معلومات اور سبق آموز مضامین کا ایسا قیمتی سرمایہ موجود ہوتا ہے جو بچوں کو صرف پڑھنے پر ہی نہیں ابھارتے بلکہ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ رسالے کی کہانیاں اور مضامین نہایت معیاری، بامقصد اور دل کو چھو لینے والے ہوتے ہیں۔

'بچوں کی دنیا' صرف بچوں کے لیے نہیں بلکہ والدین اور اساتذہ کے لیے بھی رہنمائی کا ایک قیمتی ذریعہ ہے۔ ہر تحریر یہ یاد دلاتی ہے کہ بچپن ایک نرم کلی کی مانند ہے جسے محبت، وقت اور اچھی مثالوں کے پانی سے سینچنا پڑتا ہے۔ یہ رسالہ والدین کو بتاتا ہے کہ بچوں کی تربیت صرف نصاب پڑھانے سے مکمل نہیں ہوتی بلکہ کہانیوں، اچھی صحبت اور مثبت رہنمائی سے اُن کے کردار کو سنوارنا ضروری ہے۔

'بچوں کی دنیا' بچوں کو خواب دیکھنا اور اُن خوابوں کو حقیقت بنانے کا حوصلہ دیتی ہے۔ یہ رسالہ بچوں کو یہ سبق دیتا ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد محض کامیابی نہیں بلکہ اچھا انسان بننا ہے۔

آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ 'بچوں کی دنیا' محض ایک رسالہ نہیں، یہ بچپن کا خوبصورت خواب ہے، یہ ننھی کلیوں کی خوشبو ہے، یہ آنے والے کل کی روشن صبح ہے۔ یہ ایک ایسا کارواں ہے جو بچوں کے ہاتھ میں کتاب، دل میں محبت اور ذہن میں خواب لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔ اور اس قافلے کے روشن مینار وہ تمام اہلِ قلم ہیں جنھوں نے اس رسالے کو اپنی بہترین تخلیقات سے سنوارا۔

ڈاکٹر شرمین انصاری، بھیونڈی، مہاراشٹر

برف کے گھر - اگلو

بانو سرتاج

بچو! آپ نے الگ الگ قسم کے گھر دیکھے ہوں گے، مٹی چونے، پتھر اینٹوں کے گھر، لکڑی کے گھر، بانس کے گھر، لوہے کے گھر وغیرہ۔

آج ہم آپ سے برف کے گھروں کی بات کریں گے... لو بھئی، اب آپ کہیں گے برف کے گھر ہمیں معلوم ہیں۔ بچے بناتے ہیں۔ کھیلتے ہیں ان کے ساتھ، خوش ہوتے ہیں انھیں بنا کر... ان میں کوئی رہ کیسے سکتا ہے؟ برف تو پگھل جاتی ہے، کیا اس میں رہنے سے سردی مار نہ ڈالے گی؟ برف پگھلنے سے ہم گیلے نہیں ہو جائیں گے؟

افوہ! یہ کیا ٹامی گن کی گولیوں کی طرح سوالوں کی جھڑی لگا دی آپ نے؟ صبر کرو، اور سنو برف کے گھر اگلو کی کہانی۔

عام طور پر بچے یہ جانتے ہیں کہ برف کے گھر پینگوئن بناتے ہیں، وہ ان گھروں میں رہتے ہیں، مگر غلط سو فیصد غلط ہے یہ بات۔ برف کے گھر انسان بناتے ہیں، ان میں رہتے ہیں۔ اسکیمو بناتے ہیں ایسے گھر۔

اسکیمو آرک ٹک علاقہ میں رہتے ہیں جہاں کے قدیم باشندے انوِاٹ (Inuit) کہلاتے ہیں۔ ابتدا میں انہی لوگوں نے برف کے گھر بنائے۔ بعد ازاں دوسرے علاقوں کے اسکیموز نے بھی ایسے مکان بنانے شروع کر دیے۔ گرین لینڈ، کناڈا، مشرقی روس میں بھی برف کے گھر بنائے جاتے ہیں۔

اسکیموز کو برفیلے علاقوں میں رہنے کی عادت ہوتی ہے۔ چاروں طرف برف جمی ہونے کے سبب پیڑ پودے نہیں ہوتے، اس لیے پھل پھول اور سبزیاں بھی نہیں اگتیں۔ اسکیموز کو گوشت پر منحصر رہنا پڑتا ہے، خاص طور سے سیل اور وہیل مچھلی کھا کر زندہ رہتے ہیں۔

اسکیمو، امریکہ کی قدیم زبان کا لفظ ہے۔ اس لفظ کے معنی ہیں 'کچا گوشت کھانے والا انسان'۔ یہ نام انھیں چودھویں صدی میں ملا تھا۔ الگ الگ مقامات پر رہنے والے اسکیموز کی زبان الگ الگ ہوتی ہے۔

اگلو یعنی برف کے گھر باہر سے دیکھنے پر 'آدھے فٹ بال' جیسے نظر آتے ہیں۔ جس طرح رضائی، کمبل، سویٹر انسان کے جسم کے اندر کی گرمی کو اندر ہی روک کر جسم کو گرم رکھتے ہیں، اسی طرح برف کے گھر گرمی کو برف میں روکے رکھتے ہیں۔

اگلو تین قسم کے ہوتے ہیں:

(1) چھوٹے اگلو یا برف کے گھر
(2) درمیانی سائز کے برف کے گھر، اور
(3) کشادہ برف کے گھر

(1) اسکیمو جب شکار کے لیے نکلتے ہیں تو ایک ٹمپریری اگلو بناتے ہیں۔ وہاں صرف وہ دو تین دن قیام کرتے ہیں۔ سمندری مخلوق کا شکار جمع کر لینے کے بعد وہ اگلو توڑ دیتے ہیں۔ شکار کو لے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

(2) درمیانے سائز کا اِگلو صرف ایک بڑے کمرے پر مشتمل ہوتا ہے جس میں دو خاندان آرام سے رہ سکتے ہیں۔ یہ اگلو قریب قریب بنائے جاتے ہیں جس سے اگلو ایک چھوٹی سی بستی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

(3) تیسری قسم کے اگلو ہمیشہ جڑواں (Twin) بنگلوں کی طرح بنائے جاتے ہیں۔ ایک ٹمپریری (عارضی) اور ایک پرماننٹ (مستقل)۔ پرمانٹ اگلو میں پانچ کمرے ہوتے ہیں جن میں 20 لوگ آسانی سے رہ سکتے ہیں۔ عارضی اگلو خصوصی موقعوں جیسے کرسمس، اجتماعی رقص اور جشن منانے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔

برف کے گھر بدلتے موسموں کے حساب سے بنائے جاتے ہیں۔ گرمی کے موسم کے الگ، سردی کے موسم کے الگ۔

برف کے گھروں کی تعمیر بڑی مہارت سے کی جاتی ہے۔ چاقو سے ٹھوس برف کو تراش کر بلاک بنائے جاتے ہیں۔ پھر زمین میں ایک فٹ گہری گول کھائی کھودی جاتی ہے۔ یہی گھر کی بنیاد ہوتی ہے۔ پھر تراشی ہوئی برف کی اینٹوں کی پہلی تہہ بچھائی جاتی ہے۔ پہلی تہہ کی اینٹیں نیچے سے پتلی اور اوپر سے چوڑی ہوتی ہیں۔ اندر رہنے والوں کے دم گھٹ نہ جائیں، اس لیے چھت پر ایک سوراخ بنایا جاتا ہے جس سے تازہ ہوا اندر پہنچتی رہتی ہے۔ اکثر تو چھت پر باہر سے کمبل ڈھانک دیا جاتا ہے۔ طوفان آنے پر گھر کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے گنبد کی شکل دی جاتی ہے۔ اکثر برف کے گھر میں کھڑکیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔ کھڑکیاں بنانے کے لیے لیری بو ہرن یا سیل مچھلی کے چمڑوں کا استعمال ہوتا ہے۔ بہت کم وقت میں گھر بن جاتے ہیں۔

برف کی اینٹوں کو پہلے ہی کاٹ کر نہیں رکھا جاتا۔ جماتے وقت ہی تراش کر لگایا جاتا ہے۔ درمیان کی درازوں میں تازہ برف بھر دی جاتی ہے۔ برف جم کر سخت ہو جاتی ہے۔

برف کے گھر کا داخلی دروازہ عموماً بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اس میں سے جھک کر اور کبھی کبھی تو لیٹ کر اندر داخل ہوا جاتا ہے۔ جب مکین اندر گھس جاتے ہیں تو دروازہ بند کر لیا جاتا ہے۔ چربی کا چراغ جلایا جاتا ہے۔

چراغ کی گرمی سے برف آہستہ آہستہ پگھلتی ہے۔ فٹ بال کی شکل کی ہونے کی وجہ سے پانی ٹپکتا نہیں بہہ کر نیچے گرتا ہے۔

برف کا گھر بہت مضبوط ہوتا ہے۔ ایک دو روز اسی حالت میں پڑا رہے تو بھی ٹوٹتا نہیں ہے۔ ویسے اگلو کو پھر سے مضبوط بنا لینا، درست کر لینا بھی آسان ہے۔ بس دروازہ کھول دینا پڑتا ہے۔ باہر کی برفیلی ہوائیں اندر گھستی ہیں اور پگھلتی ہوئی دیواروں میں گھس کر انھیں مضبوط کر دیتی ہیں۔ برف کا گھر یا اگلو اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں مٹر گشتی کرنے والا بھاری بھرکم بھالو بھی اس کی چھت پر آ کر بیٹھ جائے تو ٹوٹتا نہیں ہے۔

برف کے گھر پائیدار اسی وقت بنتے ہیں جب وہاں سال کے بارہ مہینے پارہ صفر سے نیچے رہتا ہو۔

آج کل برف کے گھروں کا چلن کم ہو گیا ہے۔ کئی ملکوں جیسے فن لینڈ، سویڈن، ناروے، آسٹریا وغیرہ اگلو کے شیپ والے ہوٹل بنائے جاتے ہیں۔ فن لینڈ، سویڈن، ناروے، آسٹریا وغیرہ ممالک میں لوگ اگلو ہوٹلوں میں قیام کرنا پسند کرتے ہیں۔ رات کو باہر کا نظارہ دیکھنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

■

Dr. Bano Sartaj
'Sartaj House' Jindran Nagar
Near 1st MSEB Tower
Pandharkawada Road
Yavatmal - 445001 (Maharashtra)

محمود اختر جلالپوری

مضمون

کامیابی کا راز

کامیابی پانے کے لیے کچھ اصول بنانا بے حد ضروری ہوتا ہے، ان اصولوں کی پیروی کر کے ہی کامیابی ممکن ہوتی ہے۔ اپنی زندگی کامیاب بنانے کے لیے واضح اور مخصوص مقاصد طے کرنا چاہیے، جو کامیابی کی بنیاد بنیں۔ جتنے عظیم آپ کے مقاصد ہوں گے اتنی عظیم کامیابی ہوگی۔

مستقل مزاجی اور مستقل محنت کامیابی کے بنیادی ستون ہیں۔ مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے بھی محنت جاری رکھیں۔ کسی حد تک کامیابی اور ناکامی ہماری سوچ پر بھی منحصر ہوتی ہے اس لیے مثبت سوچ اپنانا چاہیے اور مشکلات کو مواقع میں تبدیل کرنا چاہیے۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے وقت کی قدر کرنا اور وقت کو مناسب طریقے سے استعمال کرنا بے حد ضروری ہے۔ وقت کی پابندی کو اپنا اصول بنانا چاہیے۔ آج کا کام آج کریں کل پر نہ ٹالیں۔ اپنی جسمانی اور ذہنی صحت کا خیال رکھیں کیونکہ صحت مند دماغ اور صحت مند جسم ہی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ لوگوں سے اچھے تعلقات بنائیں اور ان کے ساتھ تعاون کریں۔ مثبت رجحان رکھنے والے افراد کے ساتھ وقت گزاریں۔ مثبت افراد کی محبت آپ کو زندگی میں کامیابی کی طرف لے جائے گی۔ مشکلات انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔ عظیم مقاصد کے حصول کی راہوں میں بہت سے چیلنجز کا آپ کو سامنا کرنا ہوگا۔ ان حالات میں آپ کو گھبرانا نہیں ہے بلکہ گھبرانے کے بجائے ان کا سامنا کریں۔ کسی بھی مشن کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے منظّم منصوبہ بندی کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ ہر کام کے لیے منصوبہ بندی کریں تاکہ آپ کو مقاصد تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ لوگوں سے ملیں اور سیکھیں۔ جو پہلے کامیابی حاصل کر چکے ہیں، ان کے تجربات کا مطالعہ کریں۔ ان کی غلطیوں سے سبق لیں۔ کسی بھی مشکل اور انوکھے کام کو انجام دینے کے لیے خود پر بھروسہ ضروری ہے۔ اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کریں اور خود اعتمادی پیدا کریں۔ خود پر یقین رکھنا کامیابی کی طرف پہلا قدم

ہے۔ مثبت تنقید کو قبول کرنا چاہیے۔ منفی تنقید سے گھبرانا نہیں چاہیے اور اس سے سیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی عادت ڈالیں اور اس سے سیکھنے کی کوشش کریں۔ ایک سے زیادہ لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے بہتر نتائج حاصل ہوتے ہیں بلکہ نئے خیالات اور نقطۂ نظر بھی ملتے ہیں۔ منفی عادت جیسے کہ وقت کا بیکار چلے جانا، سستی، کاہلی اور منفی سوچ سے بچنا چاہیے۔ کسی کام سے گھبرا جائیں تو کچھ دیر کے لیے باہر آ جائیں۔ مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے صبر اور برداشت سے کام لیں۔ چھوٹی چھوٹی ناکامیوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوبارہ پوری طاقت سے اپنا کام کریں۔ ہمیشہ اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ خود کو بہتر بنانے کے لیے پلان کے ساتھ کام کریں۔ مستقل اور مسلسل بہتری کی راہوں پر جانے کی کوشش کریں۔ اپنی غلطیوں کا جائزہ لیں اور ان سے سیکھنے کی کوشش کریں۔ جب بھی ضرورت ہو دوسروں سے مدد مانگنے میں جھجک محسوس نہ کریں۔ تعاون سے مسائل کا حل نکالنا آسان ہو جاتا ہے۔ ان تمام باتوں پر نظر رکھتے ہوئے اور اس پر عمل کرتے ہوئے آپ ایک کامیاب شخص بن سکتے ہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

■

Mahmood Akhtar Jalalpuri
Qazipura
Ambedkar Nagar- 224149 (UP)
Mob.: 9506316688

سید واجد علی شاہ جیلانی

مضمون

یونیسیف
بچوں کا بین الاقوامی فنڈ

بچو! یہ تو آپ سبھی جانتے ہی ہوں گے کہ یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ اس میں بہت سے ملکوں میں جہاں لاکھوں، کروڑوں انسان رہتے ہیں، انسانی زندگی میں رنج وغم، راحت وعیش، امن وامان، جنگ وجدل غرض کہ مختلف قسم کی بہت سی کیفیات سے سامنا پڑتا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں دوسری جنگ عظیم کے دوران جب بے شمار انسانی جانوں کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا، بڑی تعداد میں مالی نقصان ہوا اور بڑی طاقتوں کی جانب سے ملک جاپان پر ایٹم بم جیسے مہلک و خطرناک ہتھیار تک کا استعمال کیا گیا۔ اس دوران دنیائے انسانیت بری طرح چیخ اٹھی اور اس کو جدید اسلحہ جات کی تباہ کن قوت کا تجربہ ہوا۔ ان واقعات نے دنیا کے تمام رہنماؤں کو پریشان کردیا۔ انھیں یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اگر مستقبل میں پھر کبھی ایسی بھیانک جنگ ہوئی تو انسانی نسل جل کر راکھ ہو جائے گی۔ اس لیے ان عالمی رہنماؤں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کے بعد اس طرح کی جنگ نہ ہونے پائے۔ اس وقت سے ہی ان کے ذہنوں میں یہ خیال آنے لگا کہ عالمی پیمانے پر کسی ایسی تنظیم کی بنیاد ڈالی جائے جو دنیا میں امن وامان اور انسانی محبت پیدا کر سکے۔ آخر 24 اکتوبر 1945 کو اقوام متحدہ کی بنیاد پڑی۔ اس لیے ہر سال 24 اکتوبر کو 'یوم اقوام متحدہ' کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کا صدر دفتر امریکہ کے شہر نیویارک میں ہے۔ اس ادارے کے کچھ ذیلی شعبہ جات بھی ہیں جن میں ایک شعبہ کا نام یونیسیف (UNICEF) ہے۔ اقوام متحدہ کا یہ شعبہ دراصل بچوں کے مسائل کے تدارک کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے موقعے پر انسانی جان و مال کی زبردست تباہی ہوئی تھی۔ اس جنگ میں بے شمار بچے یتیم و لاچار ہوگئے، جن کی پرورش اور نگہداشت ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ ان بچوں کی خوراک، دوائیں، لباس جیسی ضروریات زندگی کی بنیادی چیزیں بھی میسر نہ تھیں۔ اس لیے عالمی رہنماؤں نے ان مسائل سے نمٹنے کے لیے فوری طور پر بین الاقوامی اطفال فنڈ اکٹھا کیا جس کو یونیسیف UNICEF کا نام دیا گیا جس کا مطلب ہوتا ہے United Nations

مضمون

International Childern's Emergency Fund یعنی اقوام متحدہ کا بین الاقوامی اطفال فنڈ۔ ابتدا میں یہ صرف بچوں کے مسائل کے تدارک کے لیے ہی قائم ہوا تھا لیکن آگے چل کر یہ فنڈ ترقی پذیر ممالک کے بچوں کے ساتھ ہی ان کی ماؤں کی کفالت پر بھی خرچ کیا جانے لگا اس ادارے نے بہت قلیل عرصے میں ہی مقبولیت و شہرت حاصل کرلی اور بچوں کی دیکھ بھال، ذہنی وجسمانی نشو ونما اوران کی فلاح و بہبود کے لیے نہایت اہم ونمایاں کردارادا کیا۔ یونیسیف UNICEF کو بہترین کارکردگی اور عمدہ کارناموں کے اعتراف کے طور پر سال 1965 میں نوبل انعام سے بھی نوازا گیا جو واقعی ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔اس کی مقبولیت کا ایک اور ثبوت یہ بھی ہے کہ 1983 تک اس کا دائرہ دنیا کے 110 ممالک تک پھیل چکا تھا اور آج تو شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں اس نے اپنی رسائی حاصل نہ کرلی ہو۔اقوام متحدہ کا یہ شعبہ جو آج بذات خود ایک ادارے کی حیثیت پا چکا ہے۔ 1945 سے موجودہ زمانے تک دنیا کی اتنی بڑی آبادی کے بچوں کی نگہداشت کی ذمے داری نہایت ہی کامیابی کے ساتھ اٹھاتا چلا آرہا ہے جو اس کی کامیابی کی روشن دلیل ہے۔ اقوام متحدہ کی طرح UNICEF کا صدر مقام بھی امریکی شہر نیویارک میں ہی ہے۔ اقوام متحدہ کے اس شعبے کا مقصد قیام بچوں کی فلاحی وترقیاتی کاموں کے ساتھ ہی جنگ یا کسی اور ناگہانی آفت سے متاثر ہونے والے بچوں کی دیکھ بھال کرنا بھی ہے۔ جنگ زدہ بچوں کی نگہداشت، ان کی صحت، تعلیم اور دیگر ضروریات زندگی کی فراہمی کرنا UNICEF کی اخلاقی ذمے داری ہے جو پہلے بھی متعدد مرتبہ متاثرین کی بہترین دیکھ بھال اور عمدہ پرورش کی مثال قائم کرچکا ہے۔ ■

Syed Wajid Ali Shah Jeelani
Aqeela Shaheen Mension
2-Sanjay Nagar, Gali No: 9
Rangpur Road
Kota Junction - 324002 (Raj)
Mob.: 8800972366

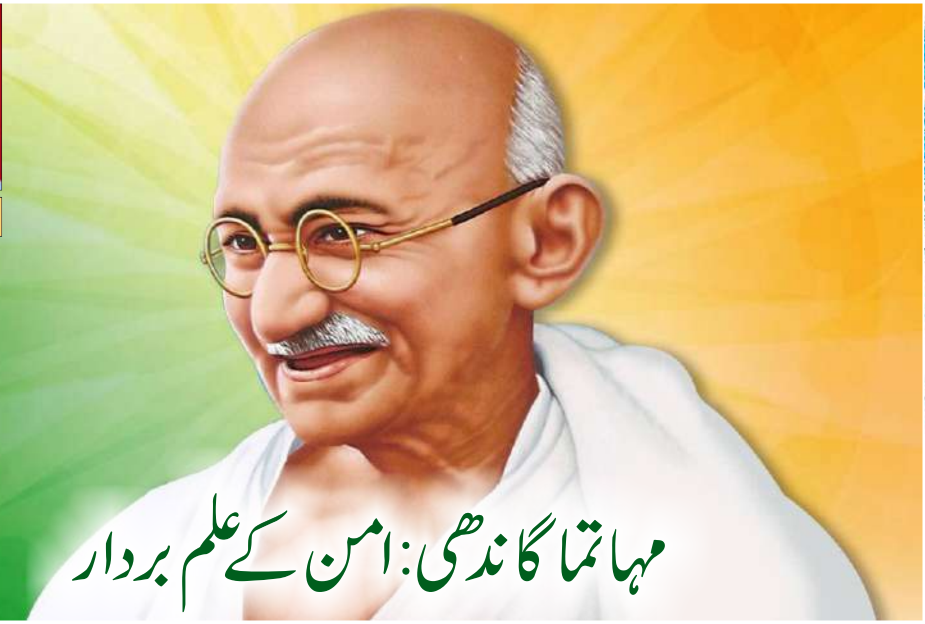

عبدالقدوس

مہاتما گاندھی: امن کے علم بردار

موہن داس کرم چند گاندھی، جنھیں ہم 'مہاتما گاندھی' یا 'باپو' کہتے ہیں، ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے عظیم رہنما تھے۔ انھوں نے سچائی، عدم تشدد، اور سادگی کے ذریعے نہ صرف ہندوستان کو آزاد کرایا بلکہ پوری دنیا کو متاثر کیا۔ ان کی زندگی ہر بچے کے لیے ایک ایسی کہانی ہے جو ہمت، محبت، اور ایمانداری کا سبق دیتی ہے۔ یہ مضمون بچوں کے لیے گاندھی جی کی زندگی، ان کے اصولوں اور ان کی جدوجہد کو سادہ انداز میں بیان کرتا ہے تاکہ وہ اس عظیم شخصیت کو آسانی سے سمجھ سکیں۔

گاندھی جی کی ابتدائی زندگی

مہاتما گاندھی 2 اکتوبر 1869 کو ہندوستان کے گجرات کے ایک چھوٹے سے شہر پور بندر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، کرم چند گاندھی، پور بندر کے دیوان تھے، یعنی وہ شہر کے اہم افسر تھے۔ ان کی والدہ، پُتلی بائی، ایک نیک اور مذہبی خاتون تھیں۔ گاندھی جی اپنی ماں سے بہت متاثر تھے۔ بچپن میں گاندھی جی شرمیلے اور خاموش مزاج تھے۔ وہ زیادہ بات نہیں کرتے تھے، لیکن دوسروں کی مدد کرنا پسند کرتے تھے۔ اسکول میں وہ ایک عام طالب علم تھے، لیکن سچ بولنے کی عادت ان کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ 19 سال کی عمر میں گاندھی جی قانون کی تعلیم حاصل کرنے لندن گئے۔ وہاں انھوں نے سخت محنت سے وکالت کی ڈگری لی۔ لندن میں انھوں نے مغربی ثقافت کو دیکھا، لیکن اپنی ہندوستانی روایات کو نہیں بھولے۔ وہ سادہ کپڑے پہنتے اور سب کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے۔ واپسی پر انھوں نے ہندوستان میں وکالت شروع کی، لیکن ان کی زندگی کا اصل موڑ تب آیا جب وہ جنوبی افریقہ گئے۔

جنوبی افریقہ میں جدوجہد

1893 میں گاندھی جی ایک وکالت کے کیس کے

لیے جنوبی افریقہ گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ ہندوستانیوں اور دیگر غیر سفید فام لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک ہوتا ہے۔ ایک مشہور واقعہ اس وقت پیش آیا جب وہ ٹرین کے فرسٹ کلاس ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ ایک انگریز افسر نے ان سے کہا کہ وہ ڈبہ چھوڑ دیں، کیونکہ وہ ہندوستانی تھے۔ گاندھی جی نے اپنی ٹکٹ دکھائی، لیکن انھیں زبردستی ٹرین سے اتار دیا گیا۔ اس رات وہ اسٹیشن پر اکیلے بیٹھ کر سوچتے رہے کہ ناانصافی کا مقابلہ کیسے کرنا ہے۔ اس واقعے نے ان کی زندگی بدل دی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بغیر تشدد کے ظلم کے خلاف لڑیں گے۔ انھوں نے اسے 'ستیہ گرہ' کا نام دیا، یعنی سچ اور محبت سے حق مانگنا۔ جنوبی افریقہ میں انھوں نے ہندوستانیوں کو متحد کیا اور ان کے حقوق کے لیے پرامن احتجاج کیا۔ انھوں نے لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ صبر اور ہمت سے بڑی سے بڑی لڑائی جیتی جا سکتی ہے۔

ہندوستان واپسی اور آزادی کی لڑائی

1915 میں گاندھی جی ہندوستان واپس آئے۔ اس وقت ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں تھا اور لوگ غلامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ گاندھی جی نے پورے ملک کا دورہ کیا اور غریب کسانوں، مزدوروں، اور عام لوگوں سے ملے۔ وہ سادہ دھوتی پہنتے اور لوگوں سے ان کی زبان میں بات کرتے تھے۔ اس سے لوگوں کو لگا کہ گاندھی جی ان کے اپنے ہیں۔

چمپارن ستیہ گرہ (1917)

گاندھی جی کی پہلی بڑی تحریک بہار کے چمپارن میں شروع ہوئی۔ وہاں کسانوں کو انگریز نے نیل کی کاشت کے لیے مجبور کیا تھا اور انھیں کم قیمت دی جاتی تھی۔ کسان بہت پریشان تھے۔ گاندھی جی نے کسانوں کے ساتھ مل کر پرامن احتجاج کیا۔ انھوں نے لوگوں کو سکھایا کہ سچ اور بغیر تشدد اپنے حقوق لے سکتے ہیں۔ آخر کار انگریزوں کو کسانوں کی باتیں ماننی پڑیں۔ یہ گاندھی جی کی پہلی بڑی کامیابی تھی۔

کھیڑا ستیہ گرہ (1918)

چمپارن کے بعد گاندھی جی نے گجرات کے کھیڑا میں کسانوں کی مدد کی۔ وہاں قحط پڑا تھا، لیکن انگریزوں نے کسانوں سے ٹیکس مانگا۔ گاندھی جی نے کسانوں کے ساتھ مل کر انگریزوں سے بات کی اور ٹیکس معاف کروانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس تحریک نے لوگوں کو دکھایا کہ گاندھی جی ہمیشہ غریبوں کے ساتھ ہیں۔

نمک ستیہ گرہ (1930)

گاندھی جی کی سب سے مشہور تحریک 'نمک ستیہ گرہ' یا 'دنڈی یاترا' تھی۔ اس وقت انگریزوں نے نمک پر بھاری ٹیکس لگایا تھا اور لوگوں کو اپنا نمک بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ گاندھی جی نے اس قانون کے خلاف احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے 12 مارچ 1930 کو اپنے آشرم سے دنڈی تک 240 میل کا پیدل سفر شروع کیا۔ 6 اپریل کو وہ دنڈی پہنچے اور سمندر سے نمک اٹھایا۔ اس چھوٹے سے عمل نے پوری دنیا کی توجہ حاصل کی۔ لاکھوں لوگوں نے گاندھی جی کی پیروی کی اور اپنا نمک بنایا۔ اس تحریک نے آزادی کی لڑائی کو اور مضبوط کیا۔

ہندوستان چھوڑو تحریک (1942)

1942 میں گاندھی جی نے 'ہندوستان چھوڑو' تحریک

شروع کی۔ انھوں نے انگریزوں سے کہا کہ وہ فوراً ہندوستان چھوڑ دیں۔ اس تحریک میں لاکھوں لوگوں نے حصہ لیا۔ گاندھی جی اور دیگر رہنماؤں کو جیل میں ڈال دیا گیا، لیکن لوگوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اس تحریک نے آزادی کی راہ ہموار کی۔

گاندھی جی کے اصول

گاندھی جی کی زندگی چند اہم اصولوں پر مبنی تھی:

سچائی: وہ ہمیشہ سچ بولتے تھے، چاہے حالات کتنے مشکل ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ سچ خدا کا روپ ہے۔

اہنسا (عدم تشدد): ان کا ماننا تھا کہ تشدد سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ محبت اور صبر سے ہر لڑائی جیتی جا سکتی ہے۔

سادگی: گاندھی جی سادہ دھوتی پہنتے اور اپنے ہاتھ سے کھادی بناتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان خود کفیل ہو۔

برابری: وہ سب کو برابر سمجھتے تھے۔ وہ چھوت چھات کے خلاف تھے اور سبھی مذاہب سے محبت کرتے تھے۔

گاندھی جی کا طرز زندگی

گاندھی جی کی زندگی بہت سادہ تھی۔ وہ ایک چھوٹے سے آشرم میں رہتے تھے، جہاں وہ خود کپڑا بناتے، سبزیاں اگاتے، اور اپنا کام خود کرتے تھے۔ انھوں نے لوگوں کو بتایا کہ سادگی سے خوشی ملتی ہے۔ وہ کھادی کے کپڑوں کو فروغ دیتے تھے تاکہ ہندوستان انگریزوں کے بنے ہوئے کپڑوں پر انحصار نہ کرے۔ ان کا ماننا تھا کہ اگر ہر شخص اپنا کام خود کرے، تو ملک مضبوط ہوگا۔

گاندھی جی اور بچوں کے لیے ان کی محبت

گاندھی جی کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ وہ بچوں کو ہندوستان کا مستقبل سمجھتے تھے۔ وہ اکثر بچوں سے باتیں کرتے اور انھیں کہانیاں سناتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بچے سچ بولیں، ہمت کریں، اور سب کے ساتھ محبت سے رہیں۔ انھوں نے ایک بار کہا تھا:

''اگر ہم اپنے بچوں کو سچائی اور عدم تشدد سکھائیں، تو ہم ایک بہتر دنیا بنا سکتے ہیں۔''

گاندھی جی کی میراث

گاندھی جی کی جدوجہد کی بدولت ہندوستان 15 اگست 1947 کو آزاد ہوا۔ ان کی تعلیمات نے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کو متاثر کیا۔ امریکی رہنما مارٹن لوتھر کنگ جونیئر نے گاندھی جی کے بغیر تشدد کے اصولوں سے متاثر ہوکر اپنے لوگوں کے حقوق کی لڑائی لڑی۔ اسی طرح جنوبی افریقہ کے نیلسن منڈیلا نے بھی گاندھی جی سے تحریک لی۔ بدقسمتی سے، 30 جنوری 1948 کو گاندھی جی کا قتل کر دیا گیا۔ وہ دہلی میں ایک دعائیہ اجلاس میں جا رہے تھے جب ایک شخص نے ان پر گولی چلا دی۔ پوری دنیا ان کی موت پر غمگین ہوئی، لیکن ان کے خیالات آج بھی زندہ ہیں۔

بچوں کے لیے گاندھی جی سے سبق

گاندھی جی کی زندگی سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے:

سچ بولو: چاہے کوئی ڈانٹے، ہمیشہ سچ بولنا چاہیے۔ دوسروں کی مدد کرو: اگر کوئی مشکل میں ہو، تو اس کی مدد کرنی چاہیے۔ ہمت نہ ہارو: مشکل وقت میں صبر اور ہمت سے کام لینا چاہیے۔ محبت سے جیو: سب سے پیار کرو، چاہے وہ مختلف مذہب یا رنگ کا ہو۔

گاندھی جی کی تحریکوں کا اثر

گاندھی جی کی تحریکوں نے ہندوستان کے لوگوں

میں ایک نئی امید جگائی۔ انھوں نے عورتوں، مردوں، بچوں، اور بوڑھوں کو ایک ساتھ لڑنے کی ہمت دی۔ ان کی وجہ سے لوگوں نے سیکھا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھا سکتے ہیں۔ ان کی تحریکوں نے انگریزوں کو دکھایا کہ ہندوستانی متحد ہو کر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

گاندھی جی کی تعلیمات آج کے دور میں:

آج بھی گاندھی جی کے اصول ہمارے لیے اہم ہیں۔ ہمارے اسکولوں میں ان کے بارے میں پڑھایا جاتا ہے۔ وہ ہمیں سکھاتے ہیں کہ ہمیں ماحول کا خیال رکھنا چاہیے، سادہ زندگی گزارنی چاہیے اور ایک دوسرے سے محبت کرنی چاہیے۔

نتیجہ

مہاتما گاندھی ایک ایسی شخصیت تھے جنھوں نے اپنی سچائی، عدم تشدد، اور سادگی سے ہندوستان کو آزاد کرایا۔ ان کی زندگی ہر بچے کے لیے ایک عظیم مثال ہے۔ وہ ہمیں سکھاتے ہیں کہ ہمیں ہمیشہ سچ بولنا چاہیے، دوسروں کی مدد کرنی چاہیے، اور مشکل وقت میں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ گاندھی جی کا پیغام آج بھی ہمیں ایک بہتر انسان بننے کی ترغیب دیتا ہے۔ اگر ہم ان کے اصولوں پر چلیں، تو ہم ایک ایسی دنیا بنا سکتے ہیں جہاں سب خوش اور محفوظ ہوں۔

■

Dr. Abdul Quddus
17-2-141/1 , Chauni Nade Ali Baig
Yakutpura
Hyderabad - 500023(Telangana)
Mob.: 7416708158
quddusnoorani@gmail.com

سیدہ فرحت

گاندھی باپو

سچی بات ہمیشہ کہنا
سچائی کے رستے چلنا
باپو نے سمجھایا ہے
باپو نے سمجھایا ہے
ایک خدا نے سب کو بنایا
اس کا سب کے سر پر سایا
باپو نے سمجھایا ہے
باپو نے سمجھایا ہے
بھارت ماں ہے ماتا سب کی
دھرتی ماں اَن داتا سب کی
باپو نے سمجھایا ہے
باپو نے سمجھایا ہے
ہندو مسلم سکھ عیسائی
آپس میں ہیں بھائی بھائی
باپو نے سمجھایا ہے
باپو نے سمجھایا ہے

■

ماخذ: بچوں کی مسکان، **مصنفہ:** سید فرحت، **دوسری اشاعت:** 2023، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

نذیر فتح پوری

منشی پریم چند

پیارے بچو! جو کہانی میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں یہ لگ بھگ آج سے تیس سال پہلے کی ہے۔ اس وقت میری عمر آٹھ دس سال کی تھی۔ میرے والد ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کی ماہانہ تنخواہ اچھی تھی۔ ہم گھر میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ میں، میرے والد اور والدہ، ایک بہن، ایک بھائی۔ یعنی کل ملا کر پانچ لوگ تھے۔ اس لیے ہمیں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ تھی۔

گھر میں مجھے سب لوگ منشی کے نام سے پکارتے تھے، لیکن میرے والد اکثر مجھے منشی پریم چند کہہ کر پکارتے تھے۔ تب میری والدہ بہت ناراض ہو جاتیں۔ کہتیں:

''تم میرے بیٹے کو ہندو بنا رہے ہو!''

والد جواب دیتے:

''ارے بھئی! اس میں ہندو مسلمان کی کیا بات ہوئی؟ پریم چند ایک بہت بڑے ادیب تھے، بہت اچھے افسانے لکھتے تھے۔ انھوں نے ناول بھی بہت لکھے ہیں، مجھے پسند ہیں۔ منشی پریم چند نے ایک افسانہ 'عیدگاہ' کے نام سے لکھا تھا۔ تو ایسے نام کا افسانہ لکھنے سے کیا وہ مسلمان ہو گئے؟

والدہ کو یہ باتیں بالکل پسند نہ آتیں۔ وہ کہتیں:

''مجھے تمھارے ناول اور افسانوں سے کچھ لینا دینا نہیں۔ بس تم میرے بیٹے کا نام مت بگاڑو...''

والد ہار نہ مانتے، کہتے:

''تم اپنے بیٹے کا نام منشی سے بدل کر کچھ اور رکھ دو، کیونکہ منشی نام جب میری زبان پر آتا ہے تو اپنے آپ ہی پریم چند بھی آ جاتا ہے... دیکھو! کتنا اچھا لگتا ہے۔ منشی پریم چند!!''

والدہ جواب دیتیں:

''لیکن ہمارے بیٹے کا نام تو رحمٰن ہے، منشی تو ہم لاڈ سے پکارتے ہیں۔''

والد جواب دیتے:

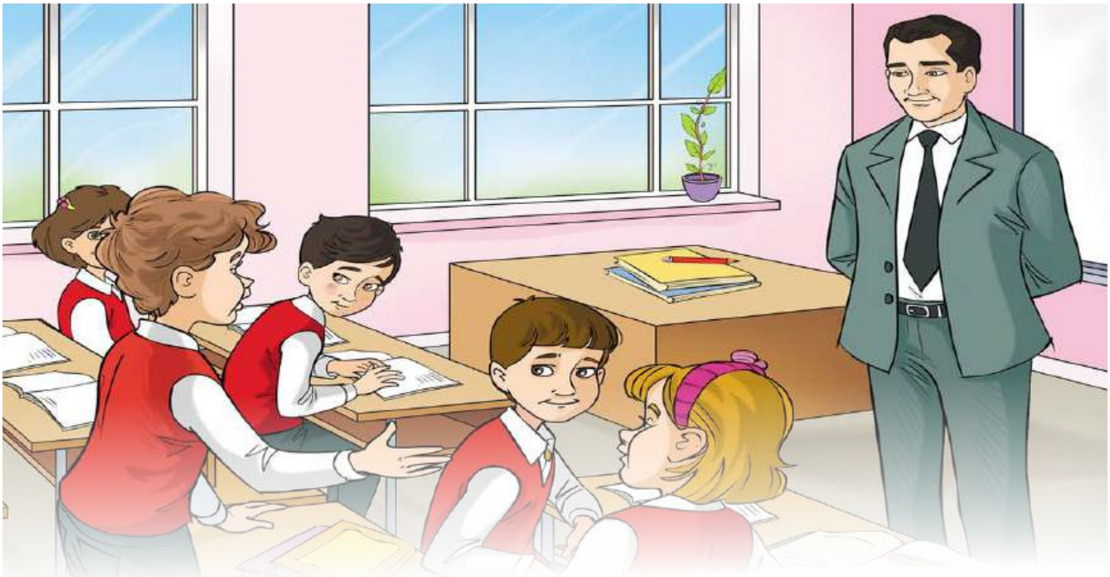

''یہ لاڈ کا نام بھی تم نے ہی رکھا تھا۔اس کا مطلب ہے منشی تمھیں اچھا لگتا ہے۔''

والدہ کہتیں:

''ہاں! مجھے منشی اچھا لگتا ہے، مجھے یقین ہے کہ میرا بیٹا بڑا ہوکر ضرور منشی بنے گا اور اونچی کرسی پر بیٹھ کر حکم چلائے گا۔''

والد بھی ضد میں آکر کہتے:

''تمھیں منشی پسند ہیں تو مجھے پریم چند پسند ہیں۔ پریم چند کتنا پیارا نام ہے۔اور جب پورا نام 'منشی پریم چند' لیتے ہیں تو منھ میں مٹھاس بھر جاتی ہے۔''

جب میں درجہ پنجم میں تھا تو ایک دن میں نے والد صاحب سے پوچھ لیا:

''آخر یہ منشی پریم چند کون تھے؟''

والد صاحب نے بتایا:

''منشی پریم چند ہماری اردو زبان کے ایک بڑے ادیب تھے۔ہندی میں بھی ان کا بڑا نام تھا۔انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے ہمارے دیش اور سماج کی بڑی خدمت کی ہے،ان کی کہانیاں بھائی چارے کا سبق دیتی ہیں۔وہ اپنی کہانیوں میں غریبوں اور کسانوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔''

والد صاحب اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے۔منشی پریم چند کے بارے میں جان کر مجھے بھی اچھا لگا۔میں نے والد صاحب سے گذارش کرتے ہوئے کہا:

''کچھ اور بتائیں منشی پریم چند کے بارے میں؟''

والد صاحب کہنے لگے:

''ہاں بیٹا! منشی پریم چند کے بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔وہ غریبوں اور کسانوں کے ہمدرد تھے۔منشی پریم چند نے ان لوگوں کا دکھ درد اور مسائل دنیا کے سامنے رکھے۔انھوں نے بھوکے پیاسے دیہاتیوں کے حالات بھی اپنے قلم کے ذریعے بیان کرکے دنیا کو بتایا۔''

والد صاحب پھر خاموش ہوگئے۔میری دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔میں نے پھر پوچھا:

''منشی پریم چند کی اپنی زندگی کیسی گزری؟''
والد صاحب کہنے لگے:
''وہ ہمیشہ غریب رہے۔ دھوتی کرتا پہنتے تھے۔ ان کے پیروں میں پھٹے پرانے جوتے ہوتے تھے۔ ان کی بیوی بھی دیہاتی ہی نظر آتی تھی۔ ان کا کوئی بڑا گھر نہیں تھا۔ بس قلم اور کاغذ ہی ان کی دولت تھی۔''
اتنے میں میری والدہ آگئیں۔ کہنے لگیں:
''کیوں میرے بیٹے کو بہکا رہے ہو۔ یہ جیسا ہے، ویسا ہی ٹھیک ہے۔ اسے منشی پریم چند کی کہانی سنا کر کیا کروگے؟''
والد صاحب خاموش رہے، وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے والدہ سے کہا:
''منشی پریم چند ایک اچھے انسان تھے۔ مجبور اور لاچار انسانوں کے دکھ درد محسوس کرکے اپنی کہانی کے ذریعے دنیا تک پہنچانا بہت اچھا کام ہے۔''
میری بات سن کر والدہ کو غصہ آیا۔ جاتے جاتے کہنے لگیں:
''تم دونوں باپ بیٹوں کو جو کرنا ہے وہ کرو، مجھے یہ سب پسند نہیں۔''
والدہ کے جانے بعد والد صاحب کہنے لگے:
''تم ابھی چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ رہے ہو، میں نے تمھاری کاپی دیکھی ہے۔ یہ اچھی بات ہے۔ بڑا ہو کر تمھیں منشی پریم چند کے جیسے اچھے کام کرنے ہیں۔ اپنے لیے تو سب جیتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے جینا بڑی بات ہے۔ ہمارے ملک ہندستان میں غریب لوگ زیادہ ہیں۔ انھیں دو وقت کی روٹی نہیں ملتی، بدن ڈھانکنے کو کپڑا نہیں ملتا، وقت پر دوائیاں نہیں ملتیں۔ تمھیں ایسے لوگوں کے حالات دنیا کے سامنے پیش کرنے ہیں، تب ہی تم قلم کے سچے سپاہی مانے جاؤگے۔
ہاں تو بچو! میں آج ہیڈ ماسٹر بن کر تمھارے اسکول میں آیا ہوں۔ آج میرا پہلا دن ہے، اس لیے میں نے اپنے بارے میں تم کو کچھ باتیں بتائیں، میں آج بھی کہانیاں لکھتا ہوں۔ میں منشی پریم چند تو نہیں بن سکا لیکن میں جو کہانی لکھتا ہوں غریبوں کی زندگی پر ہی لکھتا ہوں۔ میری کہانیاں بڑوں کے لیے کم اور بچوں کے لیے زیادہ ہوتی ہیں۔ کل تمھیں پڑھ لکھ کر بڑے بڑے عہدوں پر جانا ہے۔ تم جہاں بھی جاؤ، غریبوں کو یاد رکھنا۔ ہمارا ملک، گاؤں اور چھوٹی چھوٹی بستیوں میں زیادہ بستا ہے۔ اس لیے غریب بچوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ وہ بھی ترقی کے دوڑ میں شامل ہوسکیں، ایک پڑھی لکھی نسل ہی غربت کی زنجیریں توڑ سکتی ہے اور ملک کی ترقی میں اپنا مثبت رول ادا کرسکتی ہے۔ بس یہی میری خواہش ہے اور یہی میرا آج کا پہلا سبق ہے۔ اب تم سب اپنی اپنی کلاسوں میں جاؤ اور اپنا اپنا سبق یاد کرو۔
تمام بچے اپنی اپنی کلاسوں میں جاچکے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے تمام ٹیچر بھی چلے گئے ہیں۔ میں اکیلا میدان میں کھڑا ہوں اور سوچ رہا ہوں میرے وطن سے غریبی کب دور ہوگی....؟

■

Nazeer Fatehpuri
Saira Manzil, 203/B/102
Viman Darshan, Sanja Park
Lohgaon Road
Pune - 411032 (MS)

نظیر اکبرآبادی

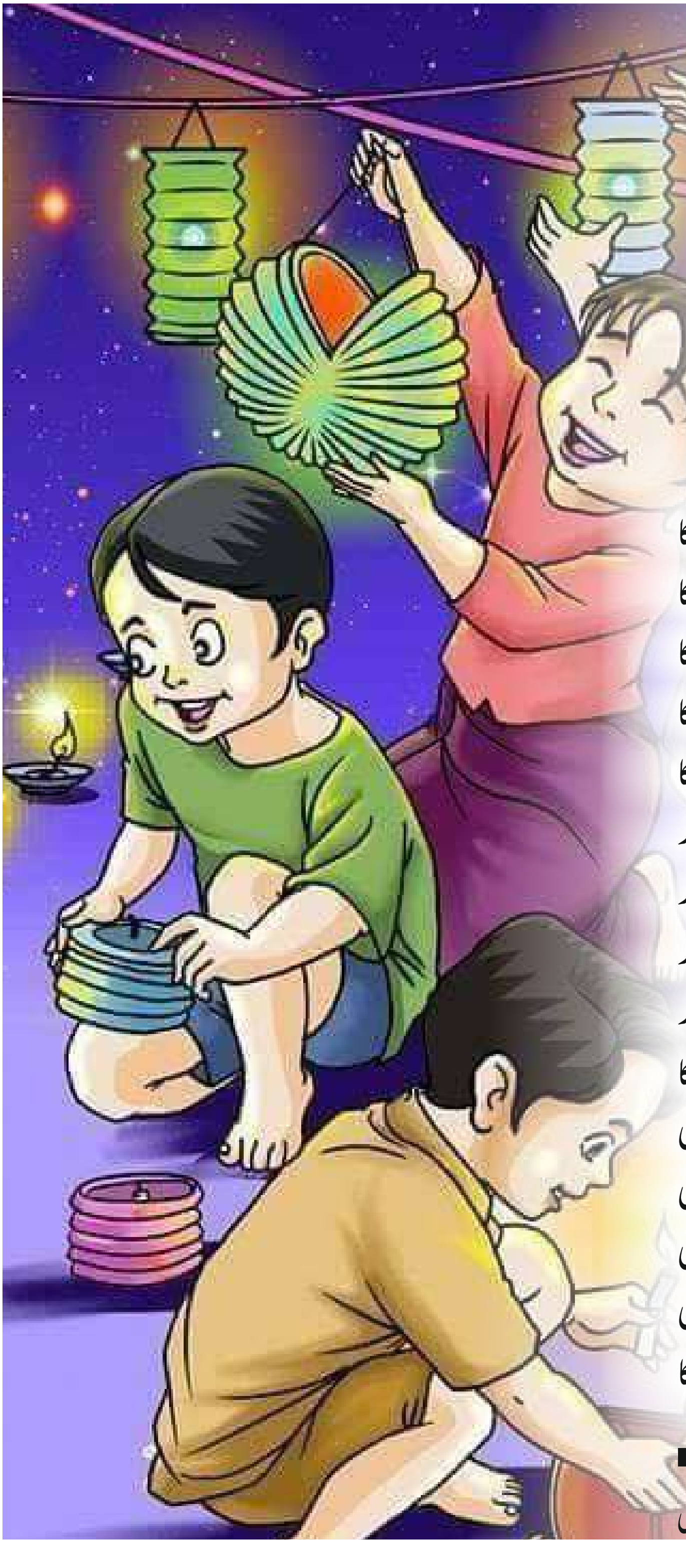

دیوالی

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دوالی کا
ہر اک طرف کو اجالا ہوا دوالی کا
سبھی کے دل میں سماں بھا گیا دوالی کا
کسی کے دل کو مزا خوش لگا دوالی کا
عجب بہار کا ہے دن بنا دوالی کا

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار
کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے ادھار
کھلونے کھیلوں بتاشوں کا گرم ہے بازار
ہر اک دکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دوالی کا

مٹھائیوں کی دکانیں لگا کے حلوائی
پکارتے ہیں کہ لالہ دوالی ہے آئی
بتاشے لے کوئی برفی کسی نے تلوائی
کھلونے والوں کی ان سے زیادہ بن آئی
گویا انھوں کے واں راج آ گیا دوالی کا

■

بشکریہ: ریختہ ڈاٹ او آر جی

شاہد جمیل

ایک پنجرہ اور دو طوطے

ایک عدد پنجرہ ہوا دو عدد طوطے ہوئے
دونوں میں جھگڑا ہوا لڑ پڑے، روتے ہوئے
ایک غرانے لگا ایک تھرانے لگا
'تو تو میں میں' یوں ہوئی دونوں میں پھر ٹھن گئی
لات اور گھونسے چلے چونچ اور پنجے چلے
رات بھر لڑتے رہے پنکھ، پر جھڑتے رہے
پنجرہ الٹا کر دیا سمجھو، چپٹا کردیا
شکل طوطوں کی اُدھر ہوگئی ایسی مگر
ایک ہوکر اَدھ مرا پنجرے میں اوندھا گرا
دوسرا چپ چاپ سے بولا اپنے آپ سے
کیوں نبھائی دشمنی؟
ہائے، کیا دُرگت بنی!

■

Shahid Jameel
202- R.D. Mansion, Ashiana-Digha Road
(Opp. Axis Bank), P.O: B.V.: College
Patna - 800014 (Bihar)
Mob.: 9471094149

مصباح الدین طارق

باپو

دو اکتوبر جب بھی آتا
گاندھی جی کی یاد دلاتا
وہ جو اَہنسا کے تھے پجاری
ساری دنیا ان پہ واری
نہیں کسی سے نفرت ان کو
شکچھا سے تھی الفت ان کو
انقلاب کی تھے ایک آندھی
موہن داس کرم چند گاندھی
کیسے بیاں ہو تیری عظمت
جگ ظاہر ہے تیری شہرت
ان کی زباں میں تھا اک جادو
کہتے تھے سب ان کو باپو
ان کی شان تھی چرخا کھادی
راج گھاٹ ہے ان کی سمادھی

■

Misbahuddin 'Tariq'
At+P.O: Luxmipur, Via: Chakand
Gaya -804404 (Bihar)
Mob.: 9801996877
misbahuddin9801@gmail.com

مناظر حسن شاہین

علم کے موتی چن لو

علم کے موتی چُن لو بچو، گیان کے موتی چُن لو
علم کی دولت سب سے بڑی ہے، بات ہماری سُن لو

اُجلے کاغذ پر ہیں کتنے سارے اکچھر پیارے
جیسے نیلے امبر پر ہوں روشن چاند ستارے
اِن پنوں میں گیان بھرا ہے پڑھو خوب اور گُن لو
علم کے موتی چن لو بچو گیان کے موتی چُن لو

علم عجب دولت ہے بچو، چور جسے نہ چرائے
اس دولت کو جتنی بانٹو اتنی بڑھتی جائے
میں بھی تم میں لٹا رہا ہوں ایک ایک کر چُن لو
علم کے موتی چُن لو، بچو گیان کے موتی چُن لو

علم کی اس دنیا میں جس کا گیان سے رشتہ ٹوٹا
رہ گیا وہ جاہل اور ان پڑھ، اس کا مقدر پھوٹا
علم عبادت گیان ہی پوجا سچ کہتا ہوں سن لو
علم کے موتی چن لو بچو گیان کے موتی چن لو

علم سے انساں چاند پہ پہنچا، گیان سے واپس آیا
جائیں گے مریخ پہ بھی ہم گیان نے گر پہنچایا
سبھی حقیقت بن جائیں گے، خواب انوکھے بُن لو
علم کے موتی چن لو بچو گیان کے موتی چُن لو

محنت سے جب پڑھو لکھو گے بنو گے دیش کے رہبر
مولانا آزاد بنو گے، بنو کے لعل جواہر
قیمتی ہیں شاہین کی باتیں خوب غور سے سن لو
علم کے موتی چن لو بچو گیان کے موتی چن لو

■

Manazir Hasan Shaheen
House No: 60, Millat Colony
Gaya - 823001 (Bihar)
Mob.: 9661214111
hussainmanazir71957@gmail.com

محمد عامر علوی عامر

ایک کہانی

میں نے سنی ہے ایسی کہانی
جس میں ہے راجا نا کوئی رانی
اڑتے ہوئے نا تخت محل ہیں
شہزادہ ہے نا پریاں دوانی
انساں کی ذہنی پرواز اس میں
سائنس کا سحر و اعجاز اس میں
دھرتی سے آگے تاروں کی دنیا
قدرت کے کھلتے نت راز اس میں
ہم کو پتہ ہے پانی ہے جیون
سانسوں کا ایندھن ہے آکسیجن
اپنی زمیں پر ہے اور کہاں ہے
جسموں کی آہٹ دل کی یہ دھڑکن
پانی بھی ہے آکسیجن وہاں ہے
بھائی ہے اس کا سب کی جو ماں ہے

ہاں ہاں وہ چندا ماما ہمارا
اپنا وہی اک اور اب جہاں ہے
انساں کی دیکھو یہ بھی کرامت
حیرانیوں کو ہے جیسے حیرت
قدرت نے رکھا پوشیدہ جس کو
وا ہورہی ہے دولت وہ نعمت
عامر چلو ہم کرلیں دعائیں
زینے ترقی کے چڑھتے جائیں
آگے گئی اور کتنے جہاں ہیں
بس اک قدم ہی نا ڈگمگائیں

■

Mohammad Amir Alvi
F-950, Gaur Siddhartham
Siddharth Vihar
Ghaziabad - 201009 (UP)
mohammad196058@gmail.com

ساحر داؤد نگری

ہوگا گھر میرا بھی پیارا

ایک پنکھ جو اڑ کر آیا
میں نے اس کو دوست بنایا
پوچھا پنکھ کہاں سے آئے
اچھے رنگ کہاں سے پائے
بولا پنکھ ذرا سا ہل کر
کل تک ماں کی گود میں بیٹھا
چھوٹ کہاں سے اڑ کر آیا
تمھیں ملوں گا پتہ نہیں تھا

***

تب تو دکھی بہت ہوگے تم
ماں کی یاد ستاتی ہوگی
چلو سجا دوں اپنے گھر میں
ماں میری خوش کتنی ہوگی

***

بولا پنکھ ذرا پھر ہنس کر
شکریہ میرے دوست تمھارا
چلو سجا دو مجھ کو گھر میں
ہوگا گھر میرا بھی پیارا

■

Sahir Daud Nagri
322/9, Lalita Park, Laxmi Nagar
Delhi -110092
Mob.: 8800489404
sahirdaudnagri1969@gmail.com

پروانہ برہانپوری

سب سے پیارا بھارت ہے

شکر خدا کیوں نہ کریں ہم، ہم نے پایا بھارت ہے
سب سے پیارا سب سے نیارا دیش ہمارا بھارت ہے

آسمان کو ہیں چھوتے پربت، پاکیزہ ندیاں ہیں
جگوں جگوں کا یہ شاہد ہے اس نے دیکھی صدیاں ہیں
جس کی دھرتی سے پھوٹی ہے امرت دھارا بھارت ہے
سب سے پیارا سب سے نیارا دیش ہمارا بھارت ہے

مٹی کی من موہنی خوشبو ہر اک دل کو بھاتی ہے
کوئل کی کوکو کانوں کے اندر رس بھر جاتی ہے
روشن روشن نکھرا نکھرا اجلا اجلا بھارت ہے
سب سے پیارا سب سے نیارا دیش ہمارا بھارت ہے

ہندو مسلم سکھ عیسائی اس میں مل کر رہتے ہیں
جیسے بچے ماؤں کی آغوش کے اندر رہتے ہیں
ہر ہندوستانی کے دل میں اک چھوٹا سا بھارت ہے
سب سے پیارا سب سے نیارا دیش ہمارا بھارت ہے

ہیں بھگت سنگھ اشفاق اللہ خاں نیتا جی بسمل ہے
اس گلشن کی سینچائی میں خون سبھی کا شامل ہے
آزادی کے متوالوں کا ہم کو تحفہ بھارت ہے
سب سے پیارا سب سے نیارا دیش ہمارا بھارت ہے

■

Parwana Burhanpuri
Gazi Salaar Maidan
Mominpura
Burhanpur - 450331 (MP)
Mob.: 8871702698

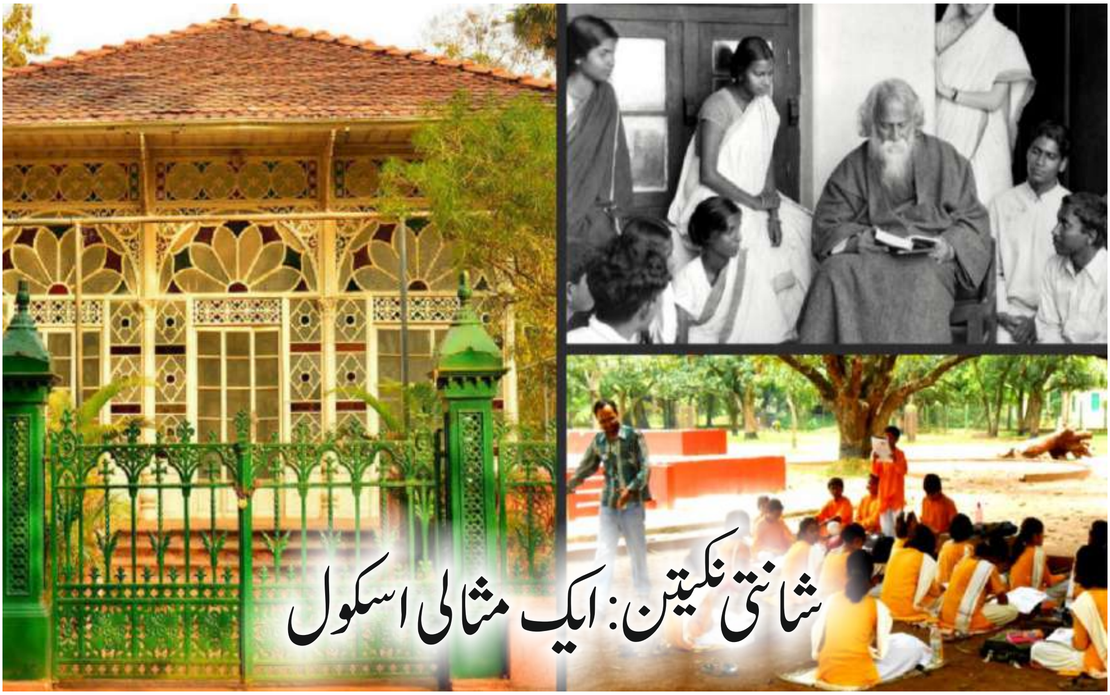

شانتی نکیتن: ایک مثالی اسکول

دس سال تک شیلدہ میں کسانوں کی بھلائی کے کام کرنے کے بعد ٹیگور 1900 میں شانتی نکیتن آ گئے تاکہ یہاں ایک اسکول کھولیں جو دوسرے اسکولوں سے الگ ایک ایسا اسکول ہو جس میں ہر مذہب، ہر زبان اور ہر قوم کے بچے مل جل کر پڑھ سکیں۔

ٹیگور کے والد نے کلکتہ سے 99 میل دور ایک آشرم بنوایا تھا اور انھوں نے اس کا نام 'شانتی نکیتن' رکھا تھا۔ اسی آشرم میں اسکول کھولنے کے لیے ان کے والد نے اجازت تو دے دی لیکن اس کو چلانے کے لیے ٹیگور کے پاس اتنے پیسے نہ تھے۔ شروع میں انھیں بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ بعض وقت تو اسکول کا خرچ پورا کرنے کے لیے انھیں اپنی بیوی کے زیورات تک رہن رکھنے پڑے کیونکہ اس وقت لڑکوں سے اسکول کی فیس نہیں لی جاتی تھی، لیکن انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ وہ دُھن کے پکے تھے۔ ان ساری رکاوٹوں کے باوجود کسی طرح اسکول چلاتے رہے۔

یہ وہی 'شانتی نکیتن' ہے جو ایک چھوٹے سے اسکول سے ترقی کرتے کرتے آج ایک بڑی یونیورسٹی 'وشوا بھارتی' بن گئی ہے۔

ٹیگور نے جس وقت شانتی نکیتن کا اسکول شروع کیا تو وہاں صرف پانچ لڑکے پڑھتے تھے، لیکن آج کئی سو لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتے ہیں جن میں ہندوستان کے علاوہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے طالب علم بھی ہیں۔

شانتی نکیتن میں تعلیم کا طریقہ دوسرے اسکولوں سے بالکل الگ ہے۔ یہاں نہ کرسیاں ہیں نہ بنچ، طالب علم اور استاد درختوں کے سائے میں چھوٹی چھوٹی جماعتیں بنا کر بیٹھتے ہیں تاکہ استاد ہر لڑکے کو اچھی طرح پڑھا سکے۔

شانتی نکیتن میں اکثر طالب علم رات دن وہیں رہتے ہیں اور کچھ نزدیک کے گاؤں سے بھی آکر پڑھتے ہیں جو شام کو گھر واپس چلے جاتے ہیں۔ جو طالب علم وہیں رہتے ہیں وہ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی جاگ جاتے ہیں اور نہا دھو کر ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور سب مل کر خدا کی تعریف کے گیت گاتے ہیں۔ اس کے بعد ناشتہ کر کے تین گھنٹے تک پڑھائی میں لگے رہتے ہیں۔ ساڑھے گیارہ بجے سب مل کر دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں۔ دو بجے سے پھر پڑھائی شروع ہوجاتی ہے اور چار بجے ختم ہوجاتی ہے اور پھر سب مل کر کھیل کود میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے بعد نہا دھو کر کچھ دیر عبادت کرتے ہیں اور سورج ڈوبنے کے بعد کھانا کھاتے ہیں، کھانے کے بعد کوئی اخبار پڑھتا ہے تو کوئی ریڈیو سنتا ہے، جس کو گانے کا شوق ہے وہ گاتا ہے، کہیں دو مل کر شطرنج کھیلتے ہیں اور پھر دس بجتے ہی سب سوجاتے ہیں۔ یہاں اتوار کے بجائے بدھ کو چھٹی ہوتی ہے۔ اس دن تمام لڑکے اور لڑکیاں سویرے ہی عبادت کے لیے ایک ہال میں جمع ہوجاتے ہیں جہاں نہ کوئی مورتی ہے اور نہ کوئی تصویر۔ اس ہال میں سب کچھ دیر آنکھیں بند کیے خاموش خدا کا دھیان کرتے ہیں۔

ٹیگور کے لیے سب مذہب برابر تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ”ہر مذہب کا ماننے والا ایک ہی خدا کو مانتا ہے۔ بچے کسی مذہب کے کیوں نہ ہوں وہ نیک لوگوں کے ساتھ رہ کر خدا سے محبت کرنے لگتے ہیں۔“

اسی لیے شانتی نکیتن میں کسی ایک مذہب کی تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ سبھی دھرم کی اچھی باتیں بتائی جاتی ہیں اور اسی لیے عبادت کے واسطے کوئی خاص طریقہ نہیں رکھا گیا ہے۔ البتہ تمام لڑکے اور لڑکیاں روزانہ صبح اور شام ایک جگہ جمع ہوکر 15 منٹ تک خاموش عبادت کرتے ہیں۔

ٹیگور نے اپنی لگاتار کوششوں سے شانتی نکیتن کے اسکول کو گھر جیسا بنایا، جہاں چھوٹے بڑے سب ایک خاندان کے لوگوں کی طرح مل کر رہتے ہیں۔ یہاں رہنے والے لڑکے اور لڑکیوں کو بھی شانتی نکیتن سے اتنی ہی محبت ہے اور وہ بھی اس کو اپنا گھر جیسا ہی سمجھتے ہیں۔

ایک دفعہ شانتی نکیتن کے اسکول کا ایک لڑکا سخت بیمار ہوگیا۔ ڈاکٹروں نے اس کو علاج کے لیے فوراً کلکتہ بھیجنے کا مشورہ دیا، چنانچہ ٹیگور نے اس لڑکے کو وہاں بھیجنا چاہا، لیکن اس کو شانتی نکیتن سے اس قدر محبت ہوگئی تھی کہ وہ ایک منٹ کے لیے بھی وہاں سے کہیں باہر جانا نہ چاہتا تھا۔ ٹیگور نے اسے بہت سمجھایا کہ تمھاری بیماری کا علاج یہاں نہیں ہوسکتا لیکن اس کے باوجود وہ لڑکا جانے کے لیے راضی نہ ہوا اور آخر کار اس کا شانتی نکیتن ہی میں انتقال ہوگیا۔

ٹیگور ہر وقت شانتی نکیتن کی ترقی کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ وہ جہاں بھی رہے انھیں اپنے اسکول کی یاد بری طرح ستاتی رہی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب وہ یورپ جارہے تھے تو اسکول کے حالات معلوم کرنے کے لیے جہاز میں بیٹھے بیٹھے ہر روز اپنے ایک دوست کے نام خط لکھتے رہے جو شانتی نکیتن میں رہتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے کئی خط لکھے لیکن جہاز سے ان خطوں کو بھیجنے کا کوئی انتظام نہ تھا اس لیے وہ سارے خط ان کے پاس ہی

رہے اور سفر سے واپس آنے کے بعد انھوں نے وہ سارے خط اپنے اس دوست کو دے دیے۔

شانتی نکیتن میں پڑھائی، عبادت اور کھیل کود کے علاوہ طالب علموں کو اچھی اور نیک باتیں بھی سکھائی جاتی ہیں، ہر مذہب اور ہر زبان کی عزت کرنا سکھایا جاتا ہے اور ہر جاندار پر رحم کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

وہاں بنگالی زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی بھی تعلیم کا انتظام ہے۔ اس لیے شانتی نکیتن میں ہر ملک، ہر مذہب اور ہر زبان کے لوگ پڑھنے اور پڑھانے کے لیے آتے ہیں۔

ٹیگور کو بہت خوشی ہوتی ہے جب دوسرے ملکوں سے پڑھانے کے لیے استاد شانتی نکیتن آتے۔

شانتی نکیتن میں ہر فن کی تعلیم کی الگ الگ شاخیں ہیں۔ سنسکرت کی تعلیم کے لیے بھی ایک شاخ ہے جس کا نام 'ودیا بھون' ہے۔ اس طرح تصویریں بنانے اور پتھر کی مورتیاں بنانے کی بھی الگ الگ شاخ ہے۔ سنگیت کی تعلیم کے لیے بھی بڑے بڑے استاد رکھے گئے ہیں جو ہندوستانی سنگیت کے ساتھ ساتھ وائلن اور پیانو بجانا بھی سکھاتے ہیں۔ ناچ کی تعلیم کے لیے بھی ایک شاخ ہے جہاں ہر قسم کے ہندوستانی ناچ کی تعلیم دی جاتی ہے اور اکثر ٹیگور کے لکھے ہوئے ڈرامے ہی پیش کیے جاتے ہیں۔ ان ڈراموں میں ٹیگور بھی کبھی کبھی کام کیا کرتے تھے۔

ٹیگور خود بھی ڈراموں میں اتنا اچھا کام کرتے تھے کہ ایک دفعہ بنگال کے مشہور اداکاروں نے ٹیگور کو ڈراموں میں کام کرتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا کہ اگر اس کام کو ٹیگور اپنا پیشہ بنالیں تو ہم لوگوں کو اپنے ڈرامے میں کام کرنے کا پیشہ چھوڑ دینا پڑے گا۔

شانتی نکیتن کے اسکول کو شروع ہوئے مشکل سے دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ نومبر 1902 میں ٹیگور کی بیوی انتقال کر گئیں۔ ٹیگور کو ان کی موت سے بڑا صدمہ ہوا، کیونکہ ان کی زندگی میں ہر قدم پر ساتھ دینے والا سہارا ہمیشہ کے لیے ان سے چھوٹ گیا تھا۔ وہ اکثر اداس رہنے لگے اور بیوی کی یاد میں نظموں کی ایک کتاب لکھی، جس کی ہر سطر سے ان کے دل کی بے چینی کا پتہ چلتا ہے۔

بیوی کے مرنے کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ دو سال بعد ان کی منجھلی لڑکی بھی چل بسی۔ اس واقعے نے انھیں اور بھی دکھی بنا دیا۔ چنانچہ وہ کچھ دنوں کے لیے ایک خوبصورت پہاڑی مقام 'المورا' چلے گئے، لیکن وہاں بھی ان کو چین نہ مل سکا۔

لڑکی کی موت کے دو سال بعد ان کے والد مہارشی دیوندر ناتھ کا بھی انتقال ہو گیا اور اس طرح اب ان کے سر سے باپ کا سایہ بھی اٹھ گیا۔

والد کو مرے ہوئے دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ ان کا سب سے چھوٹا لڑکا ہیضہ میں ختم ہو گیا۔ ان سارے دکھوں کا ٹیگور نے بڑی ہمت اور صبر سے مقابلہ کیا۔ ٹیگور نے ان ساری مصیبتوں کے باوجود اسکول کے کام کو برابر جاری رکھا اور اپنے غم کو بھلانے کے لیے بچوں کے لیے گیت لکھنا شروع کیا۔

■

ماخذ: ہمارے ٹیگور، **مصنف:** صفدر حسین، **تیسری طباعت:** 2011، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ڈراما

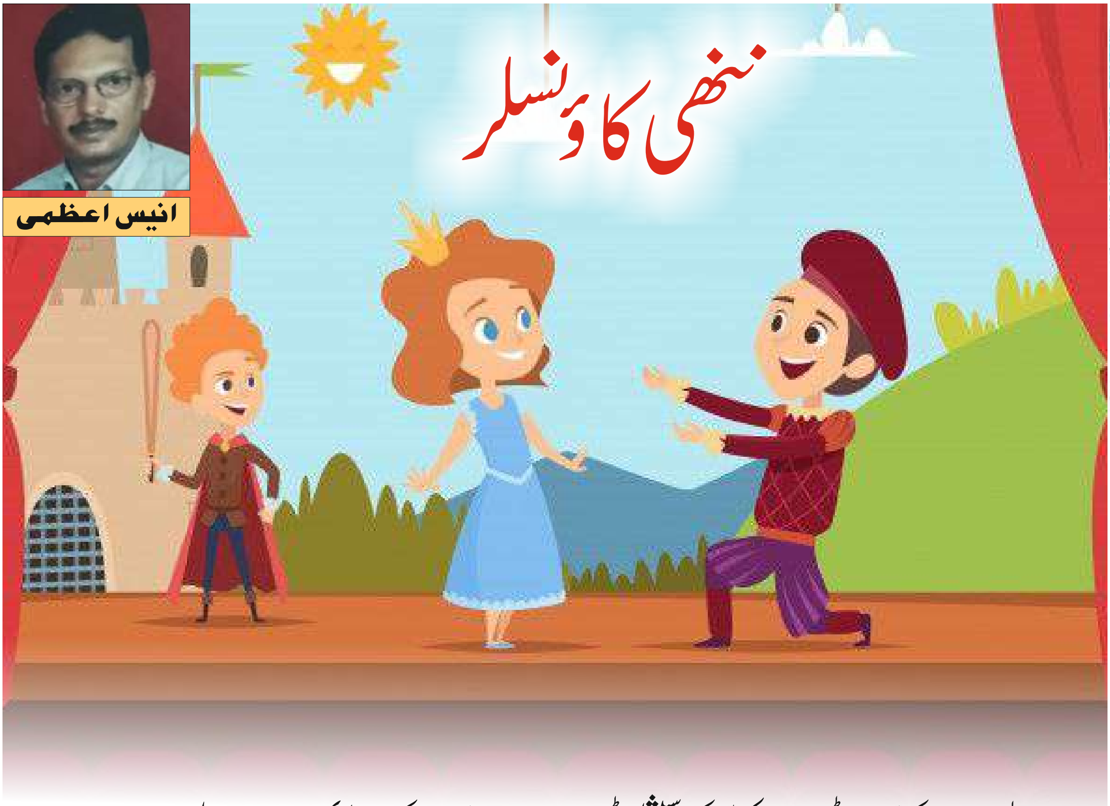

ننھی کاؤنسلر

انیس اعظمی

راوی: آٹھویں B کی کلاس ٹیچر جو اسکول کی اسپیشل ٹیچر بھی ہیں یعنی مس ممتا نے اپنی کلاس کی مانیٹر روبینہ کو اسٹاف روم میں بلاکر اپنے پاس بٹھایا اور اُسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ تمھاری کلاس میں ایک نئی بچی کا داخلہ ہوا ہے۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ وہ بچی جس کا نام رابعہ ہے وہ کلاس میں تمھارے ساتھ ہی بیٹھے۔

(مس ممتا اور روبینہ اسٹیج پر آتے ہیں اور دو کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

روبینہ: میم، میرے ساتھ میرے ڈیسک پر تو مہوش بیٹھتی ہے۔

مس ممتا: ہاں مجھے معلوم ہے لیکن مہوش کی جگہ اب تمھارے ساتھ رابعہ بیٹھا کرے گی۔ میں ایسا کسی بہت خاص وجہ سے کر رہی ہوں۔ تم کافی سمجھدار ہو، کلاس کی مانیٹر بھی ہو، اس لیے یہ ذمے داری میں تمھیں سونپ رہی ہوں۔

روبینہ: جی میم! تو پھر میں مہوش کو عنایا کے ساتھ بیٹھا دوں گی، اُن دونوں کی ٹھیک ٹھاک دوستی بھی ہے۔

مس ممتا: مجھے بہت اچھا لگے گا اگر تم اس نئی بچی رابعہ کو کم وقت میں اپنی اچھی فرینڈ بنا لوگی، مجھے امید ہے کہ تم ایسا کر سکوگی۔

روبینہ: جی میم، میں پوری کوشش کروں گی۔

مس ممتا: یہ نئی بچی رابعہ، اس اسکول کے لیے ہی نہیں بلکہ اس شہر کے لیے بھی نئی ہے۔ اس لیے اسے تمھارے سپورٹ کی ضرورت پڑے گی۔

روبینہ: اس کا مطلب رابعہ دلی کی نہیں ہے؟

مس ممتا: (ہنس کر) دلی میں دلی والے ہیں ہی کتنے؟ سب تو باہر سے آ کر یہاں بستے چلے گئے۔ رابعہ الہ آباد سے یہاں آئی ہے۔ اچھا تو کل جب رابعہ آئے تو تم اسے اپنے پاس ہی بیٹھانا اور ساری کلاس سے اُس کو ملوا دینا۔ اور ہاں بیٹا اگر تمھیں کوئی پریشانی پیش آئے تو مجھے بتانا۔

(روبینہ اُٹھ کر اسٹاف روم سے باہر آتی ہے۔ منظر بدلتا ہے۔ ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد اسٹیج پر راوی داخل ہوتی ہے/ ہوتا ہے)

راوی: ہاں تو صاحبان، اس طرح آٹھویں B میں رابعہ کا داخلہ ہو جاتا ہے، وہ اسکول آتی ہے۔ کلاس مانیٹر روبینہ اُسے اپنے ساتھ اپنے ڈیسک پر بٹھاتی ہے۔ روبینہ اس کا حال چال پوچھتی ہے، اُس کی پسند ناپسند پوچھتی ہے۔ لیکن رابعہ ہر بات اور سوال کا جواب گردن ہلا کر یا صرف دو لفظ آہستہ سے بول کر ہی دیتی ہے۔ روبینہ کو لگتا ہے کہ وہ بڑی مغرور لڑکی ہے اور اس سے دوستی کر پانا ٹیڑھی کھیر ہی رہے گا۔ رابعہ کے داخلے کے ہفتہ بھر بعد ایک دن مس ممتا نے روبینہ کو بلا کر رابعہ کے بارے میں پوچھا۔

(راوی کے جانے کے بعد منظر بدلتا ہے۔ اب اسٹیج پر مس ممتا اور روبینہ کے علاوہ کوئی نہیں ہے)

مس ممتا: ہاں بھئی روبینہ، مجھے پوری امید ہے کہ تم نے اپنی ذہانت، سمجھداری اور سوجھ بوجھ سے رابعہ کو اب تک اپنی اچھی سہیلی بنا لیا ہوگا۔

روبینہ: کہاں میڈم! میں تو سارے جتن کر کر کے ہار گئی۔ دوستی تو میم تب ہوگی جب ہمارے درمیان بات چیت ہوگی۔ میں جب بھی اس سے کچھ پوچھتی ہوں، جواب میں وہ بس اپنی گردن ہلا کر ہاں یا نا ظاہر کر دیتی ہے، وہ بھی ایسے جیسے مجھ پر کوئی احسان کر رہی ہو۔ میم کھل کر بات کرنا تو دور رہا وہ مجھ سے دو جملے بولنے کو راضی نہیں ہے۔ اللہ ہی جانے اُسے کس بات کا اتنا غرور ہے۔ مانا شکل صورت کی اچھی ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں...

مس ممتا: ہاں... ہاں... ہاں... ارے بھئی رکو تو صحیح۔ دیکھو رابعہ ابھی نئی ہے، ہم سب اس کے لیے اجنبی ہیں۔ اسے یہاں کا ماحول سمجھنے، تم لوگوں کو اپنا دوست بنانے اور اپنی جھجک کو بھگانے میں تھوڑا وقت تو لگے گا ہی۔ دیکھو، یہ کام جلد بازی میں نہیں ہوگا، اور ہاں تم بھی ذرا صبر کرنا سیکھو۔

روبینہ: میم سچ تو یہ ہے کہ وہ مجھ سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی، وہ میری بات کا جواب گردن ہلا کر ہی کیوں دیتی ہے، مجھے تو وہ کبھی خاطر میں ہی نہیں لاتی۔ ایسے میں وہ دوست کس طرح بنے گی۔

مس ممتا: (پیار سے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) شاید اسے تم پر بھروسہ کرنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔

روبینہ: پچھلے دو مہینوں سے ہم دونوں ساتھ ساتھ ایک ہی ڈیسک پر بیٹھ رہے ہیں، میم! وہ میرے ساتھ ہی نہیں، بلکہ کسی کے ساتھ گھلنا ملنا نہیں چاہتی۔ وہی جانے اس کا کیا معاملہ ہے۔

مس ممتا: (روبینہ کے چہرے کو غور سے پڑھتے ہوئے) روبینہ کیا تمھیں رابعہ میں کوئی کمزوری یا کمی نظر آئی

ہے۔ کیا تم نے غور کیا ہے کہ رابعہ تھوڑی سی توتلی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ خاموش رہ کر یا کم بول کر اپنے اس عیب کو چھپانے کی کوشش کیا کرتی ہے، وہ ایک حساس بچی ہے اور تم ایک سمجھدار بچی ہو، اسی لیے میں نے کچھ سوچ کر اُسے تمھارے پاس بیٹھایا ہے۔

(توتلے پن کی بات سن کر روبینہ کے چہرے پر ایک چمک دکھائی دیتی ہے)

روبینہ: لیکن میرے ساتھ بیٹھنے سے اسے بھلا کیا فائدہ ہوگا میم؟

مس ممتا: فائدہ ہوگا، یہ میرا وشواس ہے۔ اب تو تمھیں اس کی کمزوری کا پتہ لگ چکا ہے۔ اب یہاں سے تمھارا اہم اور پازیٹو رول شروع ہوتا ہے، تم اس کے ساتھ بالکل نارمل بن کر باتیں کیا کروگی۔ اسے اتنا پیار دو بلکہ اتنا بھروسہ دو کہ وہ بہت کم دنوں میں تم کو اپنی بیسٹ فرینڈ بنانے پر مجبور ہو جائے۔ یہ تمھیں طے کرنا ہوگا کہ تم ایسا کیا کروگی کہ اسے تمھارے بنا چین نہ آئے۔

روبینہ: آپ تو مجھے ایک بڑے مشکل امتحان میں جھونک رہی ہیں۔ اچھا مجھے بیسٹ فرینڈ بننے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟

مس ممتا: کچھ خاص نہیں کرنا ہوگا۔ ہاں جب اسے تم پر بھروسہ ہونے لگے اور جب تم سے کھل کر وہ بات کرنے لگے اور کوئی توتلا لفظ بولے تو تم کو نا تو چونکنا ہے نہ ہی اُسے ٹوکنا ہے۔ اس طرح اُس کا تم پر بھروسہ مضبوط ہوگا اور اس طرح تم سے وہ بے جھجک بات کرنے لگے گی۔

روبینہ: اب میں ساری بات سمجھ گئی میم۔ مجھے اُس کی اس کمزوری کی بہت ہلکی سی جھلک دکھائی دی تھی۔ اوہ، اب تو ساری تصویر ہی صاف ہوگئی ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ جلدی سے اس کا بھروسہ جیت سکوں۔

مس ممتا: تمھیں رابعہ کو اپنی بیسٹ فرینڈ بھی بنانا ہے اور اس کے ساتھ اس کی کاؤنسلنگ بھی کرنا ہے، اس کوشش سے وہ بہت جلد ہی نارمل ہو جائے گی۔

روبینہ: لیکن میم! میں تو کاؤنسلنگ کی الف بے تک نہیں جانتی، میں یہ کیسے کر پاؤں گی؟

مس ممتا: پریشان نہ ہو۔ میں تمھیں آہستہ آہستہ ساری ٹپس اور باریکیاں بتاتی رہوں گی۔ یقین جانو یہ کام زیادہ مشکل نہیں ہے، تم ڈرومت یہ کام کرسکتی ہو، ایسا میرا وشواس ہے۔

روبینہ: اگر آپ کو مجھ پر اتنا بھروسہ ہے تو میں بھی پوری کوشش کروں گی کہ آپ کی امیدوں پر کھری اتر سکوں۔ مس ممتا آگے بڑھ کر روبینہ کے کندھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر اس کی آنکھوں میں پیار سے دیکھتی ہیں، جیسے کہہ رہی ہوں "تمھیں میری ننھی کاؤنسلر ہو"۔ روبینہ کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ ہے، وہ خوش نظر آرہی ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

■

Anees Azmi
C-62, Nar Vihar-1
Sector-34, NOIDA-201307 (UP)
Mob.: 9891535053
anisazmi1@yahoo.co.in

کہانی

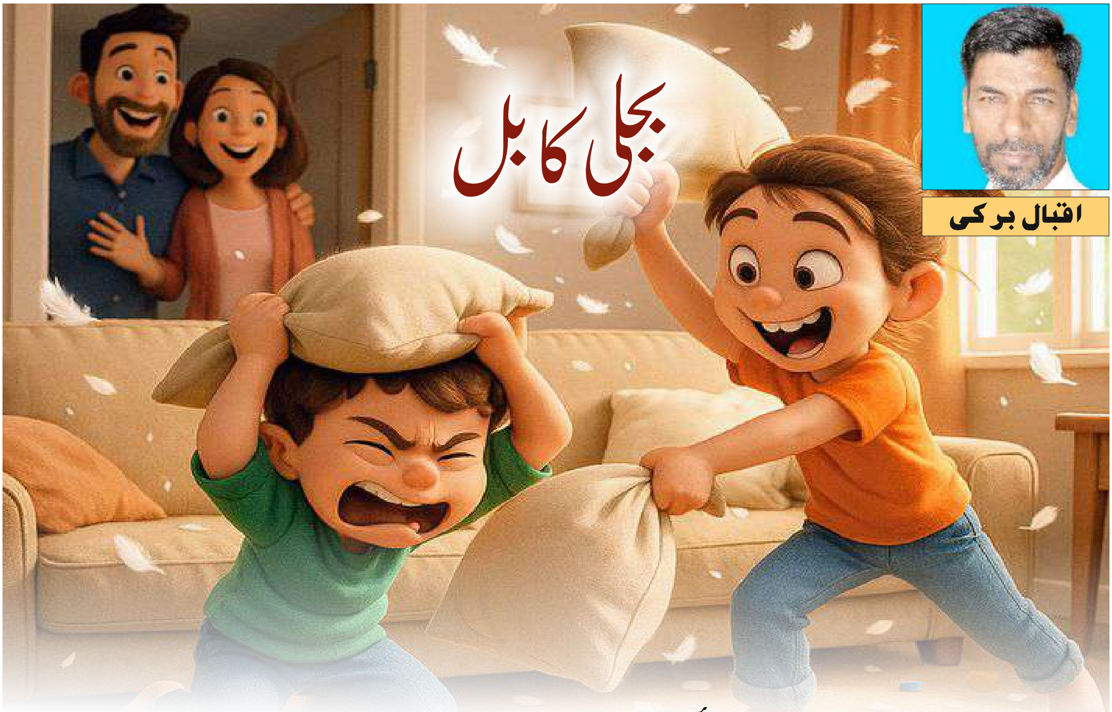

بجلی کا بل

اقبال برکی

حسبِ معمول ذرا دیر میں دونوں بھائی بہن لڑنے لگے۔ یہ جھگڑا پہلے تو تو میں میں سے شروع ہوا اور بالآخر دھول دھپے تک جا پہنچا۔ ثمینہ بڑی تھی اور تنگ آ کر اس نے چھوٹے بھائی کی پیٹھ پر دھپ سے ایک ہاتھ جما دیا۔ ہاتھ پڑتے ہی شکیب چلایا اور اس کی آواز کچن میں موجود اس کی امی نے بھی سن لی۔ ماں کچن سے تیزی سے باہر نکلی اور آتے ہی ثمینہ پر برس پڑی۔ ثمینہ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی اور بالآخر جب ماں نے پوچھا کہ ہوا کیا تھا تو اس سے پہلے کہ ثمینہ کچھ کہتی شکیب بول اٹھا۔ اس نے کہا، ”امی میں جب بھی باجی سے کہتا ہوں پنکھا فل کرو تو بس باجی مارنے لگتی ہیں۔“

ماں ثمینہ سے پوچھ گچھ کرنے کی بجائے اسی پر الٹ پڑی اور ڈانٹتے ہوئے کہا، ”کیوں؟ تم کو اتنی گرمی ہے کہ دھیمے پنکھے میں تمہارا گزر نہیں ہوتا۔ ابھی اتنی کون سی گرمی ہے کہ تم پسینے میں بہے جا رہے ہو؟“

شکیب کو ڈانٹ پڑتی دیکھ کر ثمینہ مسکرانے لگی۔ لیکن ابھی ماں اس پر توجہ بھی نہیں دے پائی تھی کہ شکیب نے احتجاج کیا۔ اس نے کہا، ”میں جب بھی کہتا ہوں کہ فین فل کرو تو باجی کہتی ہیں، بل زیادہ آتا ہے، اور فل نہیں کرتی ہے!“

ماں نے فوراً جواب دیا، ”اور نہیں تو کیا! دیکھتے ہو بجلی کا بل کتنا زیادہ آنے لگا ہے؟“

”تو کیا سارا بل فین چلنے سے ہی آتا ہے؟ اور کیا فین دھیما چلے تو کم آتا ہے؟“

شکیب بھی کٹ حجتی پر اتر آیا تھا۔

دونوں بھائی بہن اکٹھا ہوں اور دس منٹ خاموشی سے گزر جائے، ایسا اس گھر میں ممکن نہیں تھا۔ اس کی اس بحث پر ثمینہ نے کہا اور ماں نے بھی اس کی تائید کی کہ فین

فل چلنے سے بجلی کا بل زیادہ آتا ہے اور دھیما چلنے سے کم آتا ہے۔ آخر تینوں میں یہ بحث چل پڑی اور آخر طے ہوا کہ ان کے پڑوس میں بنارسی چاچا رہتے ہیں ان سے پوچھا جائے کیوں کہ وہ ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کرتے ہیں اور انہیں بڑی معلومات ہے۔ ثمینہ شکیب سے کہنے لگی، ”چلو، جلدی کرو۔ ابھی بنارسی چاچا گھر پر ہی ہوں گے ورنہ تھوڑی دیر میں مل چلے جائیں گے۔“

دونوں بھائی بہنوں نے اپنا اپنا بستہ، کتابیں، کاپیاں، پین اور پنسل ایک طرف پھینکی اور پڑوس میں بنارسی چاچا کے گھر جانے کی تیاری کرنے لگے۔

ابھی وہ گھر سے نکل کر سڑک پر آئے ہی تھے کہ انھوں نے اپنے سامنے تنویر کو پایا۔ تنویر ان کے مکان سے بائیں جانب تیسرے مکان میں رہتا تھا۔ وہ رشتے میں ان کا بھائی لگتا تھا اور اب کالج میں پڑھتا تھا۔ دونوں اپنی پڑھائی میں اکثر اس سے مدد لیا کرتے۔ تنویر کو سامنے دیکھ کر دونوں رک گئے۔ تنویر دو تین قدم چل کر ان کے ایک دم نزدیک آ گیا۔ اس نے پوچھا، ”کیا بات ہے؟ تم دونوں کہاں جا رہے ہو؟“

شکیب نے فوراً کہا، ”تنویر بھیا، ہم بنارسی چاچا کے پاس جا رہے ہیں۔ لیکن اب آپ مل گئے ہیں تو آپ ہی بتا دیجیے۔“

”ہاں... ہاں... پوچھو۔ کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟“ تنویر نے کہا۔

ثمینہ نے سوال کیا، ”تنویر بھائی، فین فل چلتا ہے تو بجلی کا بل زیادہ آتا ہے اور دھیمے چلتا ہے تو کم آتا ہے، ہے نا؟“

سوال سن کر تنویر ایک لمحے کے لیے بوکھلا گیا لیکن پھر سنبھالا لیتا ہوا بولا، ”ہاں، میرے خیال میں ایسا ہی ہے۔ فین جب دھیما چلتا ہے تو پاور کم لگتا ہے اور اسپیڈ سے گھومنے پر اسے پاور زیادہ لگتا ہے۔ ویسے پھر بھی تم بنارسی چاچا سے پوچھ لو۔ وہ مل میں جاتے ہیں، ان کو معلومات زیادہ ہے۔“

اتنا کہہ کر تنویر آگے بڑھ گیا۔ وہ جیسے ان سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ اس لیے ان کے بازو سے نکلتا چلا گیا۔ دونوں کچھ دیر اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ لیکن پھر ثمینہ نے فخریہ انداز میں شکیب کی طرف مڑتے ہوئے کہا، ”دیکھو، سن لیا نا، تنویر بھائی نے بھی یہی کہا، جو میں کہتی ہوں۔“

شکیب نے کہا، ”نہیں ان کو پورا نہیں معلوم ہے۔ اس لیے تو بولے کہ بنارسی چاچا سے پوچھ لو۔“

”اچھا تو چلو ان سے ہی پوچھ لیتے ہیں۔“ اس کی بہن نے کہا۔

”ہاں چلو۔ پوچھ لیتے ہیں۔“

دونوں جب بنارسی چاچا کے دروازے کے قریب پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ وہ اپنی چھتری کو ایک ہاتھ میں پکڑے دوسرے ہاتھ سے اس پر لگی گرد کو صاف کر رہے ہیں۔ دونوں بچوں کو دروازے کے سامنے دیکھ کر وہ رک گئے اور بڑی محبت اور ملائمت سے بولے، ”ارے بچو! شکیب، ثمینہ، بیٹا۔ آؤ۔۔ آؤ۔“

”چاچا آپ مل جا رہے ہیں؟ دیر ہو جائے گی۔“ ثمینہ نے کہا۔

”ارے کچھ نہیں بیٹا۔ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ دیر نہیں ہو گی۔ میں دیکھ لوں گا۔“ بنارسی چاچا نے محبت بھرے

انداز میں پوچھا۔

’’چاچا، ہم صرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں ... کہ ...‘‘ کہتے کہتے ثمینہ رک گئی۔

’’ہاں ہاں۔ کیا معلوم کرنا چاہتے ہو، بولو؟‘‘

’’چاچا،‘‘ شکیب کہہ اٹھا، ’’فین میں کب بجلی زیادہ لگتی ہے، دھیما چلنے پر یا اسپیڈ میں چلنے پر؟‘‘

’’یہ کیا بات ہوئی؟‘‘ ان کے منہ سے نکلا۔ اس اچانک سوال کے لیے وہ کسی طرح بھی تیار نہیں تھے۔ سوال سن کر ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ انہوں نے خود کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا۔ انھوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ بچے ان سے ایسا کوئی سوال کریں گے۔ انھوں نے تھوڑی دیر تک سوچا پھر با آواز بلند سوال کو دوہرایا اور پھر بڑے پر اعتماد انداز میں جواب دیا۔ کہنے لگے، ’’بیٹا، میرا خیال ہے کہ بلکہ بالکل یہی بات ہے اور ایسا ہی ہے۔ زور سے فین چلے گا تو بجلی بھی زیادہ لگے گی اور دھیمے پر کم لگے گی۔ ارے تم خود سوچو، ہم جب کسی چیز کو ڈھکیلتے ہیں تو اس کے وزن کے مطابق ہی طاقت لگاتے ہیں۔ بس بالکل اسی طرح پنکھا دھیما ہے تو بجلی کم اور فل ہوا تو بجلی زیادہ لے گا۔ اسی لیے تو بل اتنا آتا ہے۔ ہم لوگ تو پنکھا دھیما چلانا جانتے ہی نہیں۔‘‘

وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر انھوں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ بولے، ’’اچھا اور کوئی بات نہ ہو تو اب میں چلوں۔ ورنہ دیر ہوگی تو اوورسیر دماغ چاٹے گا۔‘‘

شکیب اور ثمینہ چوکھٹ کے پاس سے ہی کھڑے کھڑے پلٹ گئے اور باہر نکل آئے۔ ثمینہ نے شکیب کا مذاق اڑایا اور اس پر ہنستی ہوئی بولی، ’’اور کسی سے پوچھنا ہو تو پوچھ لو۔ سب کا یہی جواب ہوگا، اور سب میری ہی بات دہرائیں گے۔‘‘

’’میری بات دہرائیں گے! ٹھینگا!‘‘ شکیب جیسے چڑ سا گیا تھا۔ اس نے منہ چڑاتے ہوئے اپنی باجی کو جواب دیا۔ اس نے کہا، ’’ان کو بھی نہیں معلوم ہے۔ چلو جمیلہ میڈم سے پوچھتے ہیں۔ وہ اسکول سے آ گئی ہوں گی!‘‘

’’چلو۔ ایک ہزار لوگوں سے پوچھ لو۔ سب کا ایک ہی جواب ہوگا۔ چلو۔ جمیلہ میڈم سے پوچھ لو۔‘‘ باجی نے شکیب کو جیسے مات دے دی ہو۔ وہ اسے ہارا ہوا تسلیم کر کے اسے مخاطب کر رہی تھی۔

جمیلہ میڈم ایک اسکول ٹیچر تھیں۔ وہ صبح سے اسکول جاتی اور دوپہر کو لوٹ آتی۔ کچھ دیر آرام کرنے اور کھانا کھانے کے بعد وہ گھر پر ہی کئی بچوں کو ٹیوشن دیا کرتی تھیں۔ جب دونوں ان کے مکان پر پہنچے تو وہ اپنے پلنگ پر بیٹھی ملی۔ دونوں نے سلام کیا اور اُن کے سامنے بھی اپنا وہی سوال دوہرایا اور ان سے جواب مانگا۔ جمیلہ میڈم سوچ میں پڑ گئی۔ وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی اس کے بعد دونوں کو مخاطب کرتی ہوئی بولی، ’’دیکھو۔ اس سوال کا جواب میں یقین اور اعتماد سے نہیں دے سکتی کیونکہ مجھے بھی نہیں معلوم ہے۔ البتہ اتنا کہہ سکتی ہوں کہ یہ سوال فزکس کا ہے اور ہمارے محلے میں فزکس میں ایک ہی بچہ ہے جو گریجویٹ ہے۔ وہ اس سوال کا جواب بھی دے سکتا ہے اور بجلی کا عمل بھی سمجھا سکتا ہے۔ لیکن وہ شاید ابھی باہر ہے۔ خیر آ جائے گا تو پوچھ لینا۔‘‘

’’مگر کس سے؟ آپ نام تو بتاؤ۔‘‘ شکیب نے کہا۔

’’ارے اب میں اس کا نام بھی بتاؤں؟ کیوں

نورالدین اور تنویر تمھارے بھائی ہی ہیں نا؟ تمھارے بڑے ابو کے لڑکے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ وہ فزکس میں گریجویٹ ہے۔'' جمیلہ میڈم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے واہ! یہ تو وہی بات ہوئی بغل میں بچہ اور شہر میں ڈھنڈورا۔'' شکیب نے برجستہ کہا۔

سب ہنسنے لگے۔ جمیلہ میڈم بہت جلد اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے دوبارہ بولیں، ''بدمعاش کہیں کا! اچھا اور کچھ کہنا ہے؟ نہیں تو پھر میں کچھ دیر لیٹنا چاہتی ہوں۔''

شکیب نے کہا، ''باجی، نورالدین بھیا کل رات کو ہی آئے ہیں۔ ممبئی میں ان کی نوکری ہے۔ مگر رات کو ہی آئے ہیں۔ مجھے ملے تھے۔ چلو ان سے پوچھتے ہیں۔''

دونوں وہاں سے نکلنے سے پہلے جمیلہ میڈم کا شکریہ ادا کرنا نہیں بھولے تھے۔ دونوں سیدھے اپنے بڑے ابو کے گھر پہنچے۔ اُن کے بڑے ابو، بڑی امی، تنویر بھیا اور نورالدین بھیا سب وہیں بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ شاید نورالدین انہیں ممبئی کے احوال سنا رہے تھے۔ ان دونوں کو آتا ہوا دیکھ کر سب کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ نورالدین اور تنویر کی امی یعنی ثمینہ اور شکیب کی بڑی امی نے دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بلا لیا اور ثمینہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے بالکل بغل میں بٹھا لیا۔ وہ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی کہنے لگیں، ''آج چھٹی ہے تو تم لوگ گلی میں کیوں گھوم رہے ہو؟ تمھارے نور بھیا رات کو ہی آئے ہیں۔''

شکیب نے کہا، ''ہمیں ان سے ہی کام ہے۔''

''اچھا، مجھ سے کام ہے۔ بولو کیا کام ہے؟'' نورالدین نے انھیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

شکیب نے کہا، ''بھیا، ہمیں یہ پوچھنا ہے کہ فین جب فل چلتا ہے تو اسے زیادہ بجلی لگتی ہے اور دھیمے چلتا ہے تو کم لگتی ہے۔ کیا ایسا ہی ہے؟'' ان کے بڑے ابو دور بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ شکیب خاموش ہوتا ثمینہ کہنے لگی، ''نور بھائی بتائیے نا، یہ سیلنگ فین فل پر چلتا ہے تو زیادہ بجلی لیتا ہے۔ ہے نا؟''

نورالدین کے منہ سے نکلا، ''اوہ۔ تو یہ بات ہے؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر انھوں نے سمجھاتے ہوئے کہا، ''ثمینہ دیکھو، ہمارے یہاں عام طور پر بجلی اے سی AC ہوتی ہے۔ اور اے سی میں فین دھیمے چلے یا فل اسپیڈ میں بجلی پوری لگے گی۔ عام طور پر ہمارے پورے ملک میں اے سی بجلی استعمال ہوتی ہے۔ یعنی عام زندگی کے استعمال

کے لیے آلٹرنیٹ کرنٹ کا دو سو بیس (220) وولٹ استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح کی بجلی جب چلے تو راستے میں آنے والی رکاوٹ جسے ہم ریزسٹر (Resistor) کہتے ہیں، وہ اس پر رکے گی اور وہیں پر Heat یعنی گرمی بن کر ضائع ہو جائے گی۔ وہ نہ تو واپس ہوگی اور نہ ہی استعمال ہوگی۔ جب ہم فین چلاتے ہیں تو اس سے پہلے ایک ریگولیٹر لگاتے ہیں۔ یہ ایک ریزسٹر ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ ریزسٹر یعنی رکاوٹ بڑھے گی پنکھا اتنا ہی دھیما چلے گا اور رکاوٹ جتنی کم ہوگی پنکھا اسپیڈ میں گھومے گا۔ اس ریگولیٹر میں جو بجلی رکتی ہے وہ Heat میں تبدیل ہو کر وہیں ضائع ہو جاتی ہے۔ یعنی ہماری بجلی پوری کی پوری استعمال ہوتی ہے۔" وہ کچھ دیر ٹھہر کر پھر سے کہنے لگے۔ انہوں نے کہا، "ہاں لیکن DC یعنی ڈائرکٹ کرنٹ میں ایسا ہوتا ہے جو تم کہہ رہی ہو۔ مگر ہم اس کا استعمال بہت کم کرتے ہیں کیونکہ اس میں بڑے نقصان کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔ ان کے خاموش ہوتے ہی شکیب بول اٹھا، "میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔ مگر باجی مانتی ہی نہیں!"

"اچھا، اچھا... جناب... باجی اب مان لیں گی۔"

ان کے بڑے ابو اچانک کہہ اٹھے اور ان کے چپ ہوتے ہی سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ثمینہ کو اس کی بڑی امی نے اپنے آپ سے چمٹا لیا تھا۔ کچھ دیر بعد دونوں بھائی بہن اپنے گھر لوٹ آئے۔ مٹھائی جو نورالدین بھیا ممبئی سے لائے تھے، بڑی امی نے ان میں سے کچھ ان کے ساتھ کر دی تھی۔

■

Dr. Iqbal Berki
155, MHAD, Noor Bagh
Malegaon- 423203
Dist. Nasik (Maharashtra)
dr.iqbalbarki@gmail.com

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'بچوں کی دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................... بتاریخ...

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/145 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009

میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

Email.: magazines@ncpul.in , 011-26108159: فیکس 011-26109746: فون

دستخط

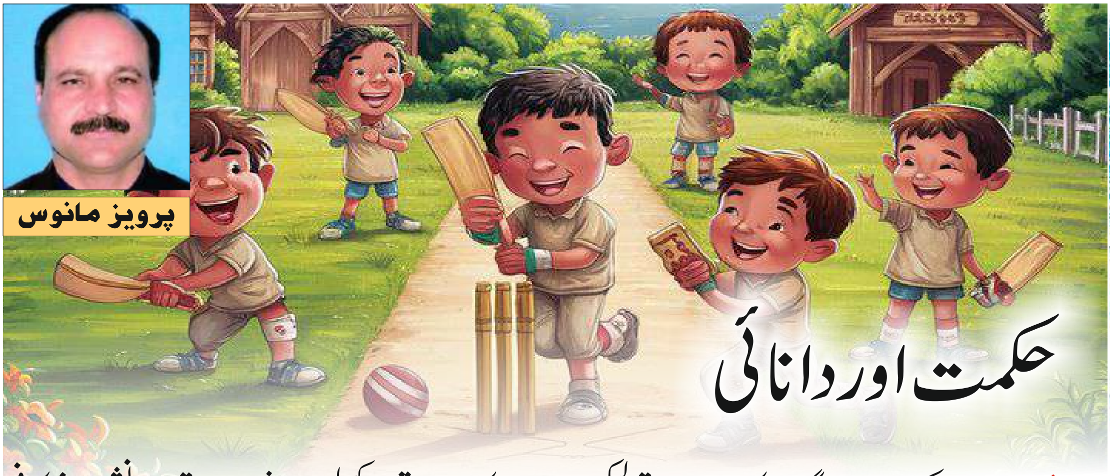

پرویز مانوس

کہانی

حکمت اور دانائی

دانش ملک ایک دور دراز گاؤں کا رہنے والا تھا لیکن نوکری کے بعد اُس کی تعیناتی شہر میں ہوگئی۔ پھر رفتہ رفتہ اُس نے پوش کالونی میں مکان بنالیا اور اب پچھلے دس برس سے شہر کی اسی کالونی میں رہتا تھا، وہ سرکاری محکمہ میں ایک ہیڈ کلرک تھا،اس کے بچے بھی یہاں کے ایک پرائیوٹ اسکول میں پڑھتے تھے، اکثر سردیوں میں اس کے والدین بھی اس کے پاس آجاتے تھے، اس کالونی میں بڑے مہذب اور شائستہ لوگ رہتے تھے، ہر مکان کے ارد گرد آٹھ فٹ اونچی دیواریں، نہ کسی سے لین دین، نہ ہی جان پہچان، سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا، دانش کو اگر کوفت تھی تو اس کالونی کے اُن بچوں سے، جو اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد محلے میں آدھمکتے اور پھر یہ کالونی ہر روز ایک عجیب منظر پیش کرتی۔

دوپہر کے بعد بچے سڑک پر جمع ہوکر کرکٹ کھیلنے لگتے۔ ان کے کھیلنے کا انداز ایسا ہوتا کہ وہ سڑک کے بیچوں بیچ وکٹیں جما کر گیندیں مارتے، اور شور مچاتے۔ کبھی کبھی گیند کسی گاڑی یا کھڑکی کو جالگتی، تو کالونی کے لوگ غصے سے چیخنے لگتے۔ مگر بچوں کو ان باتوں کی پرواہ کہاں تھی؟ ان کا واحد مقصد کھیل اور شور مچانا تھا۔ دانش نے کافی کوشش کی کہ یہ سلسلہ بند ہوجائے لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اُس نے باری باری سب کے والد سے کہا کہ ان کے بچے سڑک پر آکر دھا چوکڑی مچاتے ہیں لیکن ان کے والد یہی کہتے کہ انھیں کئی بار منع کیا ہے لیکن یہ لوگ بات نہیں مانتے۔ آخر بچے ہیں، کھیلیں گے اور شور بھی مچائیں گے۔ یہ سن کر وہ اتنا تنگ آچکا تھا کہ مکان فروخت کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

اسی دوران خزاں کا موسم اپنے پیر پسارنے لگا تو حسب روایت ایک دن دانش کے والد، حاجی رزاق جُو ،اور اس کی والدہ گاؤں سے اپنے بیٹے کے پاس شہر آئے۔ رزاق جو سیدھے سادے اور نہایت نیک دل انسان تھے۔ انھوں نے گاؤں میں اپنی پوری زندگی گزاری تھی اور وہاں کے بچوں اور بڑوں کے دل جیتنے میں ماہر تھے۔

رزاق صاحب کا حلیہ ان کے کردار کی طرح سادگی اور محبت کا مظہر تھا۔ وہ درمیانے قد کے، دبلے پتلے جسم کے مالک تھے۔ ان کے چہرے پر عمر رسیدگی کے آثار نمایاں تھے، مگر ان کی مسکراہٹ ہمیشہ شگفتگی اور نرمی سے

بھری رہتی تھی۔

رزاق صاحب کی شخصیت میں ایک ایسی کشش تھی جو ہر عمر کے لوگوں، خاص طور پر بچوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔

ایک دوپہر جب بچے سڑک پر کھیل رہے تھے اور شور مچا رہے کہ اچانک ایک گیند کھڑکی کے شیشے پر آ لگی۔ دانش نے غصے سے کھڑکی سے باہر جھانکا اور انھیں ڈانٹنے لگا۔

’’آپ کو کتنی بار کہا ہے کہ بیچ سڑک پر مت کھیلا کرو اگر کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ جاتا تو ہرجانہ کون بھرتا، چلو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ دانش کی غصیلی تقریر سن کر سونو نے وکٹیں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

’’سڑک سرکاری ہے آپ کی تو نہیں، آپ کا بیٹا بھی تو کھیلتا ہے، اب ہم اُسے اپنے ساتھ نہیں کھلائیں گے۔‘‘

ٹھہر جا بڑوں سے زبان لڑاتا ہے بدتمیز کہیں کا، دانش نے ڈراتے ہوئے بولا تو سونو "ہوں کہہ کر اپنی ٹیم کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔

رزاق صاحب، جو قریب ہی بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔انھوں نے دانش کو پیار سے سمجھایا،’’ بیٹے، ان بچوں کا اس میں کیا قصور ہے۔شہر میں کھیلنے کے میدان ہی کہاں ہیں؟ یہ بے چارے کہاں جائیں گے؟ کالونی والوں کو چاہیے تھا جہاں اتنے بڑے بڑے مکان تعمیر کیے وہاں ان معصوموں کے لیے بھی کھیلنے کی جگہ رکھتے، اگر یہ کرکٹ نہیں کھلیں گے تو یقیناً موبائل کے ساتھ چپک جائیں گے،موبائل کی لت ایک بار بچے کو لگ گئی تو پھر نجات ناممکن ہے، دیکھو انھیں پیار سے سمجھاؤ اور ان کی توجہ کسی اور طرف لگانے کی کوشش کرو۔‘‘

ابا جی....! یہ وہ بچے نہیں جو پیار سے سمجھیں، دانش نے غصے سے کہا اگر کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ جاتا تو...؟

لیکن بیٹا شیشہ ٹوٹا تو نہیں؟ وہ تو کوسکو گیند تھی، خواہ مخواہ بچوں کی نظروں میں اپنی امیج خراب کرتے ہو۔

ان معصوموں سے مت الجھا کرو، رزاق صاحب نے اُسے تحمل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

دانش کو باپ کی یہ باتیں ہضم نہ ہوئیں اور وہ بڑبڑاتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ہوں... ان کی توجہ کسی اور طرف لگاؤ.....!

دو تین روز کے بعد پھر ایسا ہی ہوا تو دانش دل مسوس کر رہ گیا کیونکہ والد صاحب کے سامنے وہ بے بس تھا۔ وہ انھیں کھیلتے اور شور مچاتے دیکھتا رہتا لیکن منہ سے کچھ نہ کہتا، وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ ان بچوں کی توجہ کسی اور طرف کیسے لگائے۔

ایک شام دانش حسبِ معمول کھڑکی کے پاس لیپ ٹاپ پر دفتر کا کام کر رہا تھا کہ بچے آ دھمکے، وہ والد کے سامنے کچھ نہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اس دن جب رزاق صاحب مسجد سے واپس آئے تو دانش سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بیٹے، تم کہتے تھے کہ یہ بڑے شرارتی بچے ہیں، یہ پیار سے نہیں سمجھیں گے، محبت اور نرمی سے دل جیتے جا سکتے ہیں۔کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔

آپ کوشش کر کے دیکھ لیں، میں تو تھک گیا، دانش نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اگلے دن رزاق جو گیٹ سے باہر نکل کر بچوں کے پاس گئے اور مسکراتے ہوئے بچوں سے سلام کیا۔ تمام بچوں نے یک زبان ہو کر سلام کا جواب بھی دیا۔ پھر

رزاق نے باری باری سب بچوں کے ساتھ مصافحہ کیا۔
مجھے بھی اپنے ساتھ کھلاؤ گے، انھوں نے بلا کو ہاتھ میں اُٹھا کر وزن کرتے ہوئے کہا تو بچے ایک دوسرے کی جانب تکنے لگے، پھر سونو بولا'' اگر آپ کو چوٹ لگ جائے گی تو دانش انکل خفا ہوں گے۔''
'' اچھا.... ! اور اگر یہی چوٹ مجھے کمرے میں آپ کی گیند سے لگے تو؟ رزاق صاحب نے عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کہا تو یہ سن کر بچوں کی نظریں جھک گئیں، اُن کی اداسی دیکھ کر انھوں نے اپنی ویسکوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا جس میں بہت سی ٹافیاں تھیں۔ بچوں نے پہلے تو حیرانی سے انھیں دیکھا، مگر جب انھوں نے ٹافیاں نکال کر ان میں تقسیم کیں تو سب خوش ہو گئے۔
رزاق صاحب نے بچوں سے کہا۔
'' پیارے بچو..... ! آپ سب بہت اچھے بچے ہو۔ لیکن یہ جو آپ یہاں بیچ سڑک پر کھیلتے ہیں، اس سے لوگوں کو پریشانی ہوتی ہے۔ کئی گھروں میں بیمار لوگ ہوتے ہیں اور آپ کے شور سے ان کو تکلیف پہنچتی ہے۔
مانا کہ کھیل کو دصحت کے لیے اچھی چیز ہے اور اس سے انسان چست رہتا ہے لیکن اس کے لیے میدان میں جانا چاہیے۔
یہاں تو کھیل کا کوئی بھی میدان نہیں ہے، آپ ہی بتائیں کہ ہم کہاں کھیلیں؟ جاوید نے آگے بڑھ کر کہا'' تو رزاق صاحب نے کہا''
دیکھو اب میں یہاں آ گیا ہوں، میرے پوتے نبیل کو بھی کھیلنا ہے، میں کل ہی یہاں کی انتظامیہ سے بات کر کے آپ کے لیے کھیل کے میدان کا بھی بندوبست کروا دوں گا لیکن تب تک اگر آپ میرا کہا مانیں گے، تو میں روز آپ کو ٹافیاں دوں گا۔''
بچے رزاق صاحب کی بات فوراً مان گئے۔ ان کے دلوں میں ان کی محبت اور نرمی نے جگہ بنا لی تھی۔ اگلے دن جب بچے دوبارہ جمع ہوئے، تو رزاق صاحب پھر ان کے پاس آئے اور ان میں ٹافیاں تقسیم کیں۔ انھوں نے بچوں کو سمجھایا کہ وہ دوسروں کی تکلیف کا احساس کریں اور اپنے کھیل کے لیے فی الحال کوئی اور جگہ تلاش کریں۔
پھر ایک وقت ایسا آیا کہ رزاق صاحب کی محبت اور حکمت نے وہ کر دکھایا جو غصے اور جھڑکیوں سے ممکن نہ تھا۔ اب انھیں اپنی خوشی کے ساتھ دوسروں کے غم کا بھی احساس ہوتا۔
بچوں کے اندر حیران کن تبدیلی کو دیکھ کر دانش بھی بہت خوش ہوا۔ گھر پہنچ کر دانش باپ کے پاس کمرے میں داخل ہوا اور بولا'' ابا جی...! واقعی آپ کی حکمت اور دانائی کام کر گئی جو کام میں زور زبردستی سے نہ کر سکا وہ آپ نے اپنی شفقت اور محبت سے کر دیا، میں شرمندہ ہوں...''
نہیں بیٹا...! قصور تمھارا نہیں، دراصل تمھارا خون ابھی گرم ہے جو فیصلے لینے میں جلدی بازی سے کام لیتا ہے، اپنے جوش کو قابو میں رکھ کر کوئی بھی فیصلہ کرو گے تو تم یقیناً کامیاب ہو جاؤ گے۔

■

Parvez Manoos
House No: 115, Azad Basti
Nattipura West
Srinagar - 190015 (J&K)
Mob.: 9419463487
parvezmaanous2020@gmail.com

کہانی

والدین سے محبت

محمد الیاس

اعظم آج بھی اسکول سے آتے وقت بہت خوش تھا۔ بستہ رکھ کر امی کو اسکول کے یوم تاسیس کی سرگذشت سنانے لگا کہ آج تو ہمارے اسکول میں کسی میڈیکل کالج کے پروفیسر صاحب آئے تھے۔اسکول کے منیجر صاحب نے بتایا تھا کہ وہ پروفیسر ہونے کے ساتھ ماہرِ نفسیات بھی ہیں اور بچوں کے ذوق وشوق اور مشغولیات سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے تمام بچوں سے ایک عجیب سا سوال کیا۔انھوں نے پوچھا آپ سب بچے ہاتھ اٹھا کر بتائیں کہ کس کس کو اپنے والدین سے محبت ہے؟

جواب میں سب بچوں نے ہاتھ اُٹھا دیے بعض بچوں نے کہا کہ یہ تو کوئی خاص سوال نہیں ہے سبھی بچوں کو اپنے والدین سے محبت ہوتی ہے۔ پروفیسر صاحب نے کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہے،سب کو اپنے والدین سے محبت نہیں ہوتی ہے،کون کون سے بچوں کو اپنے والدین سے محبت نہیں ہوتی ہے یہی میں آپ سب کو بتانے آیا ہوں۔

بچو! شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ موجودہ وقت میں بڑوں میں دو طرح کی بیماریاں زیادہ پائی جاتی ہیں ایک بلڈ پریشر (فشار الدم) اور دوسری شوگر (ذیابیطس) ان دونوں بیماریوں کے اسباب میں سب سے بڑا سبب ہے 'تفکرات' یعنی (Tension) اور یہ ٹینشن جب ہوتی ہے جب عام طور پر گھر کے مالی،کاروباری یا تعلیمی حالات ان کی امید کے مطابق نہ ہوں۔

بچے بڑے انہماک سے ان کے خیالات کو سن رہے تھے کیونکہ انھوں نے انتخاب ہی ایسے موضوع کا کیا تھا۔

انھوں نے بچوں سے پھر سوال کیا کہ تعلیمی حالات سے کیا مراد ہے، آپ سمجھے یا نہیں؟۔ اکثر بچوں نے اس کا بھی نفی میں ہی جواب دیا۔

انھوں نے کہا کہ مالی یا کاروباری حالات کو تو آپ درست نہیں کرا سکتے کیونکہ ابھی آپ کمسن ہیں لیکن آپ ان کا حوصلہ ضرور بڑھا سکتے ہیں، ان کی دلجوئی کر سکتے ہیں اور اپنی صلاحیت اور طاقت کے مطابق ان کے کام میں معاونت بھی کر سکتے ہیں مگر تعلیمی حالات کو درست کرنے میں صد فی صد آپ کا ہی دخل ہے۔ تعلیمی حالات سے مراد یہ ہے کہ آپ کے والدین آپ کو پڑھا لکھا کر کچھ اور بنانا چاہتے ہیں مگر آپ ان کی توقعات کو پورا نہیں کر رہے ہیں، گھر میں آپ کی سرگرمیاں ان کی توقعات کے مطابق نہیں ہیں، یہ اُن کی فکر کا سبب ہے؟ اس کو آپ دور کر سکتے ہیں۔

عام طور پر آپ کے والدین کوئی کاروبار کرتے ہیں، ملازمت، کھیتی یا مزدوری کرتے ہیں اور جب شام کو گھر واپس آتے ہیں تو گھر کی فضا انھیں اپنی امیدوں کے مطابق خوشگوار نہیں ملتی، وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جب وہ گھر میں قدم رکھیں تو ان کے بچے ان کو پڑھتے ہوئے اور اسکول کا کام کرتے ہوئے دکھائی دیں، مسکرا کر ان کا استقبال کریں، آپ کا یہی عمل ان کے لیے صحت بخش ثابت ہوگا۔ اس کے برعکس آپ کو موبائل میں اپنا وقت ضائع کرتے ہوئے، کھیل کود میں اپنا وقت گزارتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس سے ان کی ٹینشن اور بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ موبائل گیمس، دل بہلانے اور وقت برباد کرنے والی ویڈیوز دیکھنے کے شوق نے آج ایک بیماری کی شکل اختیار کر لی ہے، گھر کے بڑے جب تھکے ماندے گھر میں داخل ہوتے ہیں تو بچے ان کو موبائل گیمس میں مشغول دکھائی دیتے ہیں ان کو پتہ ہی نہیں چلتا گھر میں کون آ رہا ہے اور کون جا رہا ہے استقبال تو دور کی بات ہے۔ کوئی مہمان بھی آتا ہے تو گھر کے اس ماحول میں آ کر اپنے آپ ذلت محسوس کرتا ہے۔ اس طرح کے حالات پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے گھر کی فضا کو مکدر کر دیا ہے اور یہ فضا صحت بخش نہیں ہے۔

اعظم نے ان کی تقریر کو بڑی توجہ سے سنا تھا اور لفظ بہ لفظ اپنی امی کو آ کر سنا رہا تھا، اس نے کہا کہ اکثر بچے ان کی تقریر کو بڑی خاموشی سے سن رہے تھے۔ اعظم کی امی بھی ان کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہی تھیں درمیان میں یہ بھی کہتیں کہ انھوں نے درست ہی تو فرمایا کیونکہ والدین محنت کرتے ہیں اپنے بچوں کو لائق بنانے کے لیے اور اگر ان کی توقعات کو بچے پورا نہ کریں تو ٹینشن تو ہوگی اور یہ ٹینشن ان کو بیمار بھی کر سکتی ہے بلکہ عام طور پر بیمار کر ہی دیتی ہے اگر والدین سے محبت ہے تو محبت کے کچھ تقاضے بھی ہیں، ان کو ذہن نشین کرنا بچوں کے لیے لازمی ہے، اگر محبت کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا گیا تو نہ صرف بچے اپنا وقت برباد کریں گے بلکہ اپنا مستقبل بھی تباہ کر لیں گے۔

اعظم نے بتایا کہ پھر پروفیسر صاحب نے سب بچوں سے دریافت کیا کہ اب آپ مجھے یہ بتائیے کہ جن بچوں کو اپنے والدین سے محبت ہوگی کیا وہ اپنے گھر کی فضا میں ایسا زہر گھولنے کی کوشش کریں گے جس میں ان کے والدین بیمار ہو جائیں؟ اور شام کو جب وہ تھک کر گھر واپس آئیں تو ان کی تھکن میں اور اضافہ ہو جائے؟ اور وہ مریض بن جائیں یا پھر وہ اپنے گھر کے ماحول کو ایسا

خوبصورت بنائیں گے جوان کے والدین کے لیے صحت بخش ہو جسے دیکھ کر ان کا دل باغ باغ ہو جائے اور گھر آ کر ان کے بزرگ ان کو دعائیں دیں، کوئی دوسرا بھی آپ کے گھر آئے تو اسے ایسا محسوس ہو کہ اس گھر کے بچے کتنے مہذب ہیں اور آپ کی تعلیم سے دلچسپی اور تہذیب کی مثالیں دی جائیں۔ یاد رکھیے کہ اپنے بزرگوں کی تعظیم صرف وہی بچے کر سکتے ہیں جو موبائل گیم جیسی لغویات میں اپنا وقت برباد نہ کرتے ہوں کیونکہ موبائل گیم ان کو سر اُٹھانے کی مہلت ہی نہیں دیتی اور اس بیماری نے خاص طور پر نوعمر بچوں کو اپنے فریب میں اس قدر جکڑ لیا ہے کہ اگر دو یا تین یا اس سے زیادہ بچے کہیں بیٹھے ہوئے ہیں تو سب کے ہاتھوں میں موبائل ہوتا ہے اور وہ سب اسی میں کھوئے ہوئے ہوتے ہیں، یہ نئے قسم کی بدتہذیبی ہے جسے موبائل نے جنم دیا ہے اس میں محو ہونے کے بعد نہ اپنی خبر رہتی ہے اور نہ ہی دوسروں کی۔ اب آپ یہ بتائیں کہ صحیح معنی میں کس کس کو اپنے والدین سے محبت ہے؟ ہاتھ اُٹھا کر بتائیں۔

یہ سن کر بچوں میں سناٹا چھا گیا، ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے، چہ می گوئیاں ہونے لگیں کہ کیا جواب دیا جائے، پروفیسر صاحب نے سب کی ایک اہم نبض پر جو ہاتھ رکھ دیا تھا، پھر پروفیسر صاحب خود ہی کہنے لگے۔ میں جانتا ہوں اکثر بچے اس بیماری میں مبتلا ہیں، اسی لیے ہاتھ اُٹھانے میں تردد ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بچو! آج ایک اہم نکتہ کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں گا اور وہ یہ کہ ''دنیا کا سب سے آسان کام ہے پڑھنا'' وہ اس طرح کہ آپ کو صرف اپنے اسکول یا مکتب آنا ہے یہاں آپ کے لیے تمام سہولیات مہیا ہیں، آپ کے تعلیمی اخراجات آپ کے والدین اُٹھاتے ہیں، آپ کو آنے اور جانے کے لیے تمام سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ صرف آپ کو یہاں اسکول کا کام کرنا ہے اور گھر جا کر ہوم ورک کرنا ہے۔ بس یہی ایک چھوٹی سی ذمے داری ہے اگر اس کو پورا کیا گیا تو یہ والدین سے محبت کا ثبوت ہے اور اگر اس ذمے داری کو پورا نہیں کیا گیا تو یہی اُن سے عداوت ہے۔ آپ اپنا وقت اور ان کی محنت کا روپیہ برباد کر رہے ہیں اور اپنا مستقبل داؤ پر لگا رہے ہیں کیونکہ یہ وقت اگر آپ نے لہو ولعب میں گزار دیا تو یہ تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ وقت کسی بھی قیمت پر دوبارہ نہیں آئے گا۔

پروفیسر صاحب جب بچوں سے خطاب کر رہے تھے تو کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی سب ہمہ تن گوش تھے، بچوں کو ان کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ کچھ دن بعد میں پھر آپ کے درمیان آؤں گا اور پھر یہ سوال کروں گا آپ جواب دینے کے لیے تیار رہیں کہ کس کس کو اپنے والدین سے محبت ہے۔ کون کون اپنے والدین کو بیماریوں سے پاک صحت اور سلامتی کے ساتھ دیکھنے کا خواہش مند ہے؟ اور کون کون ان کو خوش دیکھنا چاہتا ہے؟ آپ کو اس کا صحیح جواب دینا ہے، اُس وقت تک کے لیے خدا حافظ! اور اس کے بعد وہ رخصت ہو گئے۔

■

Dr. Mohd Ilyas
385, Peetal Basti
Moradabad - 244001 (UP)
Mob.: 9412838085
ilyas385@gmail.com

روبینہ

موبائل کی دنیا

احمد کی آنکھیں موبائل کی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے کمرے میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا، صرف موبائل کی نیلی روشنی اس کے چہرے پر ایک بے جان سا چاند بنا رہی تھی۔ اس کی گردن میں تکلیف تھی، کندھے اکڑے ہوئے تھے اور آنکھیں جل رہی تھیں، لیکن پھر بھی وہ اسکرین سے نظر نہیں ہٹا سکتا تھا۔ رات کے دو بج چکے تھے، لیکن اسے نیند کہاں؟ وہ مسلسل سوشل میڈیا پر اسکرول کر رہا تھا، کبھی انسٹاگرام پر رنگ برنگی تصاویر دیکھتے ہوئے تو کبھی فیس بک پر بے مقصد ویڈیوز چلاتے ہوئے۔

''احمد بیٹا! سو جاؤ اب، صبح اسکول جانا ہے'' اس کی امی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دیتے ہوئے کہا۔ ان کی آواز میں پریشانی کی جھلک تھی۔

''جی امی، بس پانچ منٹ'' احمد نے بے دلی سے جواب دیا، اس کی نظریں اب بھی اسکرین پر گڑی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ پانچ منٹ کبھی ختم نہ ہوئے۔ اس کی انگلیاں لگاتار اسکرول کرتی رہیں، جیسے اس کا اپنے اوپر کوئی کنٹرول ہی نہ ہو۔

صبح جب اس کی امی نے اسے جگایا تو احمد کا جسم سیسے کی طرح بھاری لگ رہا تھا۔ وہ بمشکل اٹھ سکا، اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں، جیسے وہ رات بھر رویا ہو۔ سر میں تیز درد کی لہریں دوڑ رہی تھیں اور منہ کا ذائقہ تلخ تھا۔ اسکول جانے کے لیے تیار ہونے میں اسے بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل بے قراری سے دھڑک رہا تھا۔

''احمد، تم ٹھیک تو ہو؟'' اس کے ابو نے ناشتے کی میز پر پریشانی سے پوچھا۔ وہ کئی دنوں سے اپنے بیٹے کی حالت دیکھ رہے تھے۔

''جی ابو، بس تھوڑی تھکان ہے،'' احمد نے بھرائی آواز میں جھوٹ بولا، اس کا پیٹ خالی تھا لیکن کھانے کا بالکل دل نہیں کر رہا تھا۔

اسکول میں احمد کی حالت اور بھی خراب ہوتی گئی۔ کلاس میں اس کا دھیان بالکل نہیں لگ رہا تھا، استاد کی آواز دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، جیسے وہ کسی گہرے کنویں کی تہ میں بیٹھا ہو۔ ریاضی کے استاد نے جب سوال حل کرنے کو کہا تو احمد کو لگا جیسے وہ کسی اجنبی زبان میں بات کر رہے ہیں۔ وہ کھوسا گیا، اس کے ہاتھ پسینے سے تر تھے اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ دوپہر کو لنچ کے وقت بھی وہ بے چینی کے عالم میں موبائل پر گیمز کھیلتا رہا، کھانا نظر انداز کرتے ہوئے۔

اس کا بہترین دوست عمران کئی دنوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عمران نے محسوس کیا کہ پچھلے کئی مہینوں سے احمد بالکل بدل گیا ہے۔ پہلے وہ کلاس میں سب سے تیز

طالب علم ہوا کرتا تھا، کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا، ہمیشہ ہنستا کھیلتا رہتا تھا، لیکن اب وہ ہمیشہ تھکا ہوا، چڑچڑاہٹ میں اور کھویا کھویا سا نظر آتا تھا۔ کھیل کود میں بالکل دلچسپی نہیں لیتا، یہاں تک کہ دوستوں سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔

احمد کے والدین نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی امی نے ابو سے پریشانی سے کہا، ”احمد کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ وہ کھانا ٹھیک سے نہیں کھاتا، رات دیر تک جاگتا ہے، اور صبح اٹھنے میں بہت مشکل پیش آتی ہے۔“

احمد کے ابو نے سوچ کر کہا، ”مجھے لگتا ہے یہ موبائل کا مسئلہ ہے۔ میں نے دیکھا ہے وہ ہر وقت اس میں مگن رہتا ہے۔“

”لیکن اگر ہم اس سے موبائل چھین لیں گے تو وہ اور پریشان ہو جائے گا۔ ہمیں کوئی بہتر طریقہ سوچنا ہوگا۔“

ایک دن عمران نے احمد سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ احمد کچھ چھپا رہا ہے۔

”احمد، کیا بات ہے یار؟ تم اتنے تبدیل کیوں ہو گئے ہو؟ تم پہلے اتنے خوش رہا کرتے تھے۔“

احمد نے پہلے ٹال دیا، ”کچھ نہیں یار، بس تھوڑا پریشان ہوں۔“

لیکن عمران نے اصرار کیا، ”احمد، ہم بچپن سے دوست ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ چھپا رہے ہو۔ مجھے بتاؤ، شاید میں تمھاری مدد کر سکوں۔“

آخر کار احمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے اپنی پریشانی بتائی۔

”یار، میں بہت پریشان ہوں۔ میں موبائل کے استعمال پر قابو نہیں رکھ پا رہا۔ رات دیر تک جاگتا ہوں، لیکن نہیں سو سکتا کیونکہ ہمیشہ یہ لگتا ہے کہ کوئی میسج آیا ہے یا کوئی نئی پوسٹ۔ گیمز کھیلتا ہوں اور وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ سوشل میڈیا پر گھنٹوں وقت ضائع کرتا ہوں۔ میری پڑھائی بالکل خراب ہو رہی ہے، میری صحت متاثر ہو رہی ہے، میں بے چین رہتا ہوں، لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا۔ جب موبائل نہیں ہوتا تو لگتا ہے جیسے میں کچھ اہم چیز کھو رہا ہوں۔“

عمران نے احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، ”احمد، میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ مجھے بھی یہی مسئلہ درپیش تھا چھ مہینے پہلے، لیکن میں نے اس پر قابو پا لیا ہے۔“

”کیسے؟“ احمد نے امید بھری نظروں سے دیکھا۔

”سب سے پہلے، ہمیں ایک منصوبہ بنانا ہوگا۔ موبائل کو مکمل طور پر چھوڑنا ناممکن ہے۔ اس کے استعمال میں توازن قائم رکھنا بہت ضروری ہے اور سب سے اہم بات، تمھیں اپنے والدین سے بھی بات کرنی چاہیے۔“

عمران نے احمد کو کچھ عملی تجاویز دیں: موبائل میں اسکرین ٹائم ایپ استعمال کرو جو ہر ایپ کے استعمال کا وقت محدود کرے، رات آٹھ بجے کے بعد موبائل والدین کے پاس جمع کرا دو، پڑھائی کے وقت موبائل دوسرے کمرے میں رکھو یا سائلنٹ موڈ پر کرو، ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ کھیل کود کے لیے نکالو، دوستوں کے ساتھ حقیقی زندگی میں زیادہ وقت گزارو اور اپنے والدین سے اپنے مسئلے کے بارے میں کھل کر بات کرو۔

احمد نے ہمت کر کے اپنے والدین سے بات کی۔ شروع میں وہ گھبرایا ہوا تھا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہوں، لیکن اس کی امی نے پیار سے اسے گلے لگا لیا۔ ”بیٹا، ہم پہلے

سے جانتے تھے کہ کچھ نہ کچھ مسئلہ ہے۔ اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ اب ہم سب مل کر اس مسئلے کا حل نکالیں گے۔''

احمد کے ابو نے کہا، ''احمد، یہ کوئی شرم کی بات نہیں۔ آج کل بہت سے بچوں کو یہ مسئلہ درپیش ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ تم نے اسے تسلیم کیا اور مدد مانگی۔'' والدین نے احمد کے ساتھ مل کر ایک منصوبہ بنایا: شام کو پورا خاندان ایک ساتھ کھانا کھائے گا، موبائل کے بغیر، ہفتے میں دو دن ''ڈیجیٹل ڈیٹاکس'' ہوگا جب گھر میں کوئی بھی موبائل استعمال نہیں کرے گا، احمد کے کمرے سے پہلے چارجر ہٹایا جائے گا تا کہ رات کو موبائل چارج کرنے کا بہانہ نہ بن سکے اور والدین بھی اپنا موبائل کا استعمال کم کریں گے تا کہ بچوں کے لیے مثال قائم کرسکیں۔

احمد نے ان تجاویز پر عمل شروع کیا، لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پہلے تین دن تو بالکل کٹھن گزرے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کا کوئی اہم حصہ کٹ گیا ہے۔ رات کو بستر پر لیٹ کر وہ بے چین ہوتا، بار بار اٹھ کر موبائل تلاش کرتا۔ اس کے ہاتھ کانپتے، دل تیزی سے دھڑکتا، اور پسینہ آتا۔

چوتھے دن احمد نے عمران سے کہا، ''یار، میں نہیں کر سکتا۔ یہ بہت مشکل ہے۔''

عمران نے ہمت دلائی، ''احمد، یہ نارمل ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ لیکن تم ہار مت مانو۔ دیکھو، آج چوتھا دن ہے، پہلے ہفتے سے زیادہ مشکل کچھ نہیں۔'' احمد کی امی نے بھی اس کا ہاتھ تھام کر کہا، ''بیٹا، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جب بھی پریشان ہو، ہم سے بات کرو۔''

پانچویں دن احمد نے محسوس کیا کہ اس کی بے چینی کچھ کم ہوئی ہے۔ ساتویں دن اسے پہلی بار کئی دنوں بعد اچھی نیند آئی۔ لیکن پھر آٹھویں دن اس سے غلطی ہوئی اور وہ دوبارہ رات بھر موبائل چلاتا رہا۔ صبح اس نے شرم محسوس کی اور عمران سے کہا، ''یار، میں پھر سے ناکام ہوگیا۔''

عمران نے سمجھایا، ''احمد، یہ کوئی ناکامی نہیں۔ عادت بدلنا آسان نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم ہار نہ مانیں اور دوبارہ کوشش کریں۔'' اگلے کچھ ہفتوں میں احمد کے ساتھ کئی بار ایسا ہوا۔ کبھی وہ کامیاب رہتا، کبھی پھسل جاتا۔ لیکن دھیرے دھیرے فاصلے بڑھتے گئے۔ پہلے روزانہ پھسلتا تھا، پھر ہفتے میں دو بار، پھر ہفتے میں ایک بار۔

دوسرے ہفتے میں اس نے محسوس کیا کہ اس کی نیند بہتر ہو رہی ہے۔ آنکھوں کی جلن کم ہوئی۔ صبح اٹھنے میں آسانی ہوتی۔ تیسرے ہفتے میں کلاس میں توجہ بڑھنے لگی۔ استاد کی باتیں صاف سنائی دینے لگیں۔ پانچویں ہفتے میں وہ دوبارہ کرکٹ کھیلنے لگا، لیکن ابھی بھی پہلے جتنی تیزی نہیں تھی۔ آٹھویں ہفتے میں جا کر احمد نے محسوس کیا کہ وہ واقعی بہتر محسوس کر رہا ہے۔ اس کی توانائی واپس آ رہی تھی، جسم میں طاقت محسوس ہوتی اور سب سے اہم بات، اب وہ موبائل کے بغیر بھی خوش رہ سکتا تھا۔

دو ماہ بعد احمد کے والدین نے بھی واضح تبدیلی محسوس کی۔

''احمد بیٹا، تم پہلے جیسے ہو گئے ہو'' اس کی امی نے خوشی اور فخر سے کہا۔ ''تمھارا چہرہ پہلے جیسا چمک رہا ہے۔''

احمد کے ابو نے کہا، ''مجھے فخر ہے کہ تم نے اتنی ہمت دکھائی۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔''

تیسرے مہینے میں اس کے امتحانی نمبر بھی بہتر ہونے لگے۔ وہ دوبارہ کلاس میں سرفہرست آنے لگا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اب وہ زیادہ خوش اور مطمئن تھا۔ اسے احساس ہوا کہ حقیقی زندگی، دوستوں کے ساتھ کھیلنا، فطرت میں وقت گزارنا، کتابیں پڑھنا، موبائل کی اسکرین سے کہیں زیادہ خوبصورت اور تسکین دینے والا ہے۔

چوتھے مہینے میں ایک دن احمد کا موبائل خراب ہو گیا اور مرمت کے لیے دو دن دکان میں رہا۔ پہلے یہ احمد کے لیے کسی آفت سے کم نہ ہوتا، لیکن اب حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔ بلکہ وہ ان دو دنوں میں کافی خوش رہا۔ جب موبائل واپس آیا تو احمد نے عمران سے کہا، ''یار، پہلے اگر موبائل ایک گھنٹے کے لیے بھی نہ ہوتا تو میں پاگل ہو جاتا تھا۔ لیکن اب دو دن بغیر موبائل کے گزارے اور کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔''

اس واقعے کے بعد احمد نے اپنے دوسرے ساتھیوں کی بھی مدد کرنا شروع کر دی جو موبائل کی لت سے پریشان تھے۔ اس نے عمران کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا گروپ بنایا ''متوازن زندگی'' کے نام سے، جہاں وہ ٹیکنالوجی کے مثبت استعمال پر بات کرتے، تجربے شیئر کرتے اور ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے۔ انھوں نے اسکول میں ایک پروگرام بھی شروع کیا جس میں بچوں کو ڈیجیٹل ڈیٹاکس کے فوائد کے بارے میں بتایا جاتا۔

آج، چھ مہینے بعد، احمد ایک مکمل طور پر متوازن زندگی گزار رہا ہے۔ وہ موبائل استعمال کرتا ہے، لیکن صرف ضرورت کے مطابق۔ اس کے پاس اب کتابیں پڑھنے کا وقت ہے۔ دوستوں سے ملنے جلنے، باہر کھیلنے اور اپنے خاندان کے ساتھ معیاری وقت گزارنے کا وقت ہے۔

وہ اکثر کہتا ہے، ''موبائل ایک بہترین آلہ ہے، لیکن ہمیں اس کا استعمال عقلمندی سے کرنا چاہیے۔ یہ ہماری زندگی کو آسان اور بہتر بنانے کے لیے ہے، لیکن اسے اپنی زندگی کا مرکز نہیں بنانا چاہیے۔ حقیقی خوشی تو باہر کی دنیا میں، لوگوں کے ساتھ، فطرت میں ہے۔''

پیارے بچو! اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ کسی بھی مسئلے کا حل تب تک ممکن نہیں جب تک ہم اسے تسلیم نہ کریں، اپنے والدین اور دوستوں سے مدد مانگنا کمزوری نہیں بلکہ بہادری ہے، عادت بدلنا وقت لیتا ہے۔ کئی بار ناکامی کا سامنا ہو سکتا ہے، لیکن ہار نہیں ماننی چاہیے، والدین کا کردار بہت اہم ہے۔ وہ سزا دینے کی بجائے مدد اور سمجھ کا ہاتھ بڑھا سکتے ہیں، اور ٹیکنالوجی کو مکمل طور پر چھوڑنا نہ ضروری ہے اور نہ ممکن، لیکن اس کا متوازن استعمال ضروری ہے۔

یاد رکھیں، ہمیں اپنی صحت، تعلیم، سماجی تعلقات اور ذاتی نشوونما کو ہمیشہ ترجیح دینی چاہیے۔ موبائل فون ہماری زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے، لیکن صرف تب جب ہم اس کا استعمال سمجھداری سے کریں۔

''زندگی کا حقیقی لطف ٹیکنالوجی میں نہیں، بلکہ حقیقی رشتوں اور تجربات میں ہے۔''

■

Dr. Rubeena
Asst. Prof., Dept of Education and Training
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Mob.: 9492530291

منصور خوشتر

ننھی تتلی کی ہمت

سورج کی پہلی کرن جیسے ہی آسمان کے گلابی پردے کو چیر کر نکلی، جنگل جاگ اٹھا۔ درختوں کے پتے شبنم سے دھل کر چمکنے لگے۔ ہوا میں ایک میٹھی خوشبو گھل گئی تھی — کہیں گیندے کے پھول کھلے تھے، کہیں چمپا کے جھرمٹ اور کہیں گلاب اپنی مہک بکھیر رہے تھے۔ ایک طرف بلبل سریلی تان میں گنگنا رہی تھی اور دوسری طرف مور اپنے پنکھ پھیلا کر خوشی سے ناچ رہا تھا۔

جنگل کے کنارے، ایک نازک سی شاخ پر، رنگ برنگی پروں والی ننھی تتلی بیٹھی تھی۔ اس کا نام پری تھا۔ پری کے پر ایسے لگتے تھے جیسے کسی نے قوسِ قزح کو کاٹ کر اس پر سجا دیا ہو — نیلا، پیلا، سبز، نارنجی، اور بیچ بیچ میں چمکدار دھاریاں۔

لیکن آج پری کے چہرے پر خوشی نہیں، ڈر کا سایہ تھا۔ وہ بار بار اپنے پروں کو دیکھتی، پھر نیچے زمین کو اور پھر گہری سانس لے کر آہ بھرتی۔

''آج میری اڑان کا پہلا دن ہے... لیکن اگر میں گر گئی تو؟ اگر میں کیچڑ میں جا گری تو؟'' اس نے خود سے کہا اور ایک پتے کی اوٹ میں چھپ گئی۔

جھاڑیوں سے ایک چھوٹا سا گول مٹول سا کیڑا کودتا ہوا آیا۔ یہ تھا موٹو — پری کا سب سے پیارا دوست۔ موٹو ہمیشہ ہنستا رہتا تھا، جیسے زندگی میں کوئی غم ہی نہ ہو۔

''پری! آج کا دن کتنا حسین ہے! دیکھو، بادل دور ہے، ہوا ہلکی ہے، سورج مسکرا رہا ہے۔ یہ اڑنے کے لیے بہترین دن ہے!'' موٹو نے خوشی سے کہا۔

پری نے نظریں جھکائیں، ''مجھے ڈر لگ رہا ہے، موٹو۔ میرے پر بہت ہلکے ہیں۔ اگر میں ہوا میں گر گئی تو؟''

موٹو نے اسے تسلی دی، ''گرنا برا نہیں ہوتا، پری۔ برا تب ہوتا ہے جب ہم گرنے کے ڈر سے اڑنا ہی چھوڑ دیں!''

اسی وقت بھن بھن کی آواز سنائی دی۔ دادا مکھی، جو جنگل کے سب سے بزرگ اور سمجھدار مکھی تھے، اپنے پرانے چشمے اور بوسیدہ جوتے پہنے ہوا میں تیرتے ہوئے آ پہنچے۔

''بھن بھن بھن! او پری بیٹی، میں نے ہزار بار کہا ہے — اُڑنے کے لیے پر نہیں، حوصلہ چاہیے! اگر گر جاؤ تو اٹھو اور دوبارہ اڑو۔ یاد رکھو، سب سے اونچی اڑان وہی بھرتا ہے جو سب سے زیادہ گر کر اٹھتا ہے!''

پری نے آہستہ سے سر ہلایا، مگر دل کا ڈر ابھی بھی باقی تھا۔

اسی لمحے ایک درخت سے پھرتیلی گڈو گلہری نیچے اتری۔ گڈو کی آنکھیں ہمیشہ چمکتی رہتی تھیں اور وہ ہر وقت دوڑتی بھاگتی رہتی تھی۔

''پری! اڑنا سیکھ لو تو تم جھیل کے کنارے، جنگل کے بیچ، اور بادلوں کے قریب تک جا سکتی ہو۔ سوچو کتنا مزہ آئے

گا!'' گڈو نے شرارت سے کہا۔

پھولوں کے باغ سے چمپا ہرنی بھی آ گئی۔ وہ نازک مزاج تھی مگر دوسروں کی ہمت بڑھانے میں ماہر۔ ''پری، میں جب دوڑتی ہوں تو ہوا میرے کانوں میں سرگوشی کرتی ہے۔ تم اُڑو گی تو ہوا تمھارے ساتھ گائے گی!''

اسی وقت ایک چہکتی آواز آئی۔ چونچو چڑیا آ کر ایک شاخ پر بیٹھی اور بولی،

''پری اُڑ، پری اُڑ،
حوصلے کا پر پھیلا۔''

پری نے اپنے سب دوستوں کو دیکھا۔ دل میں ایک چنگاری سی جاگی، پری نے گہرا سانس لیا، اپنے پر پھیلائے اور شاخ سے ہلکی سی چھلانگ لگا دی۔

''وووہووو!'' چند لمحوں کے لیے وہ ہوا میں تیرنے لگی، لیکن توازن بگڑتے ہی نیچے جا گری — سیدھی نرم گھاس کے ڈھیر پر۔

''اوئی ماں!'' پری نے کہا۔

موٹو ہنس پڑا، ''تم گری کہاں؟ پھولوں پر! اگلی بار اور بہتر ہوگا!''

دادا مکھی نے تالیاں بجائیں، ''بہت خوب! ایک بار پھر!''

پری نے دوبارہ کوشش کی۔ اس بار وہ تھوڑا اوپر اڑی، پتوں کے بیچ سے گزرتی ہوئی دھوپ میں جھلملائی۔

اچانک آسمان پر کالے بادل چھا گئے۔ ''گڑ گڑ گڑررر...'' یہ تھا شرارتی بادل گول گپّا۔

''ہا ہا ہا! میں آ گیا! چلو سب بھیگو!'' اور موٹی موٹی بوندیں برسنے لگیں۔

موٹو ایک پتے کے نیچے چھپ گیا، گڈو گلہری اپنے بل میں گھس گئی، چونچو کسی گھنے درخت میں جا بیٹھی اور دادا مکھی ایک سوراخ میں غائب ہو گئے۔

پری نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دل نے کہا، ''اب رک گئی تو کبھی اُڑ نہیں پاؤں گی۔''

پری نے اپنے پروں سے پانی جھاڑا اور پورے زور سے اڑان بھری۔ بارش کی بوندیں اس کے پروں سے ٹکرا رہی تھیں، لیکن وہ تھمی نہیں۔

''وووہوووو!'' وہ کبھی اوپر جاتی، کبھی نیچے جھولتی، کبھی بارش کے قطروں کو چیرتی۔

بوڑھا برگد، جو برسوں سے جنگل کا محافظ تھا، دھیرے سے بولا، ''یہ ہے اصل ہمت! جو طوفان میں بھی نہ رکے، وہی سچا پرندہ یا تتلی ہے!''

بارش تھمی تو جنگل کے سب جانور باہر آ گئے۔ گڈو نے تالیاں بجائیں، چونچو نے خوشی کا گیت گایا، چمپا ہرنی نے پھول نچھاور کیے۔

دادا مکھی نے کہا، ''پری، تم نے سکھا دیا کہ اصل کامیابی کوشش میں ہے، جیت یا ہار میں نہیں۔''

موٹو نے فخر سے کہا، ''دیکھا، تم کر سکتی تھی!''

پری نے مسکرا کر کہا، ''اب مجھے پتا چلا، ہار وہی مانتا ہے جو کوشش چھوڑ دیتا ہے۔''

■

Dr.Mansoor khushter
Editor
Darbhanga Times
Darbhanga - 846004 (Bihar)
Mob.: 9234772764
mansoorkhushter@gmail.com

یاسمین بانو

ماحول کا محافظ

ویسے تو یہ آف پیریڈ تھا لیکن عقیل سر اکثر آف پیریڈ میں بھی بچوں کو کچھ نہ کچھ کارآمد باتیں سکھا دیا کرتے تھے۔ لنچ بریک ختم ہونے کی گھنٹی بجتے ہی عقیل صاحب کلاس میں داخل ہوئے۔ انھوں نے آج بچوں کے ٹفن کے بارے میں پوچھا۔ کسی نے کہا ''ہم میگی لائے تھے، کسی نے کہا پزّا اور کسی نے کہا برگر'' بہت ہی کم بچے ایسے تھے جو سبزی، چپاتی لائے تھے۔ عقیل سر نے فاسٹ فوڈ کے نقصانات اور گھر کی بنی سبزی چپاتی کے فوائد کے بارے میں بچوں کو انتہائی اہم معلومات دی۔ بچے اپنے اپنے بینچوں پر بیٹھے باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ''شکیل سر نے تو ٹفن پر اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔'' عمیر نے کہا ''ارے یار، ان کی تو بات ہی نرالی ہے۔ میں تو انھیں ہر بات میں الگ پاتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ زمانے سے بہت پیچھے چل رہے ہیں۔ بوتل تو گھر سے کبھی لاتے ہی نہیں ہیں مٹکے کا پانی ہی پینا پسند کرتے ہیں۔ یوسف نے کہا '' ارے میں تو ان کے گھر کے قریب ہی رہتا ہوں بڑے سے آنگن میں اتنے بڑے بڑے درخت لگا رکھے ہیں جیسے جنگل ہو، اور حیرت کے بات تو یہ ہے کہ ایک دن جب میں اپنے ابو کے ساتھ ان کے گھر گیا تو حیران رہ گیا۔ شاہ زیب اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ عمیر بیچ میں ہی بول پڑا۔ ''حیران کرنے والی کون سی بات ہو گئی شاہ زیب۔ ارے آپ سنو تو گرمیوں کے دن تھے پیاس بڑی شدت کی تھی اور شکیل سر کے گھر سے مٹکے کا پانی آیا۔ اتنی شدید گرمی میں تو فریج کے پانی کی ضرورت ہوتی ہے مٹکے کا پانی تو حلق سے نیچے ہی نہیں اتر رہا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ سر کے یہاں فریج بھی نہیں ہے۔ ہے نا حیران کر دینے والی بات کہ اتنی تنخواہ کے باوجود بھی سر فریج نہیں خرید سکے۔ شاہ زیب نے اپنی بات مکمل کی۔ تھیلی تو جناب کپڑے کی استعمال کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کس دور میں جی رہے ہیں ہمارے سر۔ جب کہ اس دور میں کوئی بھی کپڑے کی تھیلی استعمال کرنا پسند نہیں کرتا، یہ کہہ کر شاہ زیب نے زور سے قہقہہ لگایا اور اس کے ساتھ ہی دوسرے لڑکوں نے بھی زوردار قہقہہ لگایا۔ خالد سب کی باتوں پر غور کر رہا تھا اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اگلے پیریڈ کا گھنٹہ بج گیا اور عقیل سر کلاس میں تشریف لائے۔ ان کے آتے ہی کلاس میں سناٹا چھا گیا۔

خالد، عقیل سر کی عجیب وغریب باتوں پر غور وفکر کرتا رہا۔ ایک دن اس نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ وہ خود عقیل سر کے پاس جا کر ان سے ملاقات کرے۔ ایک دن دوپہر میں آف پیریڈ تھا اور عقیل سر اسکول کے گارڈن میں ایک

بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ خالد وہاں پہنچ گیا۔ عقیل سر کو سلام کیا اور کہا ”مجھے آپ سے کچھ سوالات پوچھنے تھے۔“ خالد نے انتہائی ادب سے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ عقیل سر نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ہاں ضرور پوچھو بیٹے خالد۔“ اور خالد کو بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سر کچھ باتیں ایسی ہیں جو مجھے بڑا کنفیوژ کر رہی ہیں۔ میں اپنا کنفیوژن دور کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے میں دیکھتا ہوں کہ آپ بوتل کے پانی کو پینا پسند نہیں کرتے، مٹکے کے پانی کو پسند کرتے ہیں۔ آپ کپڑے کی تھیلی استعمال کرتے ہیں، کیری بیگ کو پسند نہیں کرتے وغیرہ۔“ بیٹے خالد ہم آپ کے ہر کنفیوژن کو دور کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ دیکھو بیٹے جب کسی پلاسٹک کی بوتل میں ہم زیادہ دیر کے لیے پانی رکھتے ہیں تو اس میں جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں جو پانی کے ساتھ ہمارے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں اور ہماری صحت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں اور کئی بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔ پلاسٹک کی کیری بیگ کا استعمال بھی ہمارے لیے انتہائی نقصان دہ ہوتا ہے۔ ہمارے استعمال کے بعد یہ کوڑے میں چلی جاتی ہے۔ سیکڑوں برس تک کوڑے میں دبا رہنے کے باوجود یہ مٹی میں نہیں ملتی اور مٹی اور پانی کو آلودہ کرتی رہتی ہے۔ یہ آلودگی زرعی پیداوار کو نقصان پہنچاتی ہے اور ہماری غذا کی فراہمی کو متاثر کرتی ہے۔ مچھلیاں اور دیگر آبی جاندار پلاسٹک کے ذرات کو خوراک سمجھ کر نگل لیتے ہیں، جو ان کی موت کا سبب بنتے ہیں۔ پلاسٹک کی مصنوعات میں موجود کیمیکلز، جیسے کہ بی پی اے اور فیتھیلیٹس، انسانی صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ یہ کیمیکلز کینسر، اور دل کی بیماریوں کا باعث بن سکتے ہیں۔ گائے، بیل، بکری جیسے جانور جب کوڑے میں سے کچھ کھاتے ہیں تو یہ کیری بیگ ان کے پیٹ میں چلی جاتی ہے اور بعض اوقات ان کی موت کا سبب بنتی ہے۔ یہ کیری بیگ جب کسی گٹر کی جالی میں جا کر پھنس جاتی ہے تو بارش کا پانی رک جاتا ہے جس کی وجہ سے کافی جانی اور مالی نقصان ہوتا ہے۔ خالد عقیل سر کی تمام باتوں کو غور سے سنتا رہا۔ جب عقیل سر تھوڑا رکے تو خالد نے کہا ”سر آپ نے مجھے بہت اچھی معلومات دی۔“ عقیل سر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”خالد بیٹے دیکھو، اللہ کے فضل و کرم سے ہمارے گھر میں ہر چیز موجود ہے لیکن فریج نہیں ہے، اس بات سے آپ کو حیرانی ہوگی اور ایسا بھی نہیں ہے ہم فریج نہیں خرید سکتے لیکن دراصل بات یہ ہے بیٹے کہ گرمی کے موسم اور چلچلاتی دھوپ میں برف کا ٹھنڈا پانی گلے اور جسم کو گرمی سے فوراً راحت تو دلاتا ہے، لیکن یہ ہماری صحت کو بری طرح متاثر کرتا ہے۔ یہ سردی کھانسی کے ساتھ ساتھ نظام ہاضمہ کو بھی متاثر کرتا ہے، برف کا پانی یا بہت ٹھنڈا پانی پینا ہمارے دل کو نقصان پہنچاتا ہے اور بھی کئی طرح کے مسائل اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ فریج سے کلورو فلورو کاربن گیس خارج ہوتی ہے جو ہوا کو آلودہ کرتی ہے اور اوزون لیئر کو نقصان پہنچتا ہے۔ اوزون لیئر کے بارے میں تو آپ نے سائنس میں پڑھا ہی ہے۔ خالد نے انتہائی ادب سے جواب دیا ”جی سر۔“ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ پودے آکسیجن فراہم کرتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کرتے ہیں آکسیجن ہمارے لیے اور ہمارے ماحول کے لیے انتہائی

ضروری ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کی زیادتی کی وجہ سے اوزون لیئر میں سوراخ ہوجاتے ہیں۔سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اوزون لیئر میں اب کافی سوراخ پڑ گئے ہیں جس کی وجہ سے سورج سے نکلنے والی زہریلی شعاعیں زمین پر پڑ رہی ہیں اور مختلف بیماریوں کا سبب بن رہی ہیں۔اسی لیے بیٹے ہم نے اپنے گھر میں بے شمار پودے اور بڑے درخت لگا رکھے ہیں۔ خالد عقیل سر کی تمام باتوں کو غور سے سنتا چلا جارہا تھا۔''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔لیکن سر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک دو لوگوں کے اس طرح عمل کرنے سے تو ماحولیاتی آلودگی پر قابو پانا ممکن نہیں؟'' خالد نے سوال کیا،عقیل سر نے کہا''دیکھو بیٹے خالد،اس بات کو سمجھانے کے لیے ہم آپ کو ایک کہانی سناتے ہیں۔کسی زمانے میں ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا اس نے کٹوری نما ایک بڑا سا حوض بنوایا اور رعایا میں یہ اعلان کروا دیا کہ آج رات ہر شخص ایک گلاس دودھ لے کر آئے اور اس حوض میں ڈال دے۔ حوض اتنا اونچا بنایا گیا تھا کہ اس کی آخری سیڑھی پر چڑھنے کے بعد کوئی بھی شخص اپنا ہاتھ لمبا کر کے اس میں اپنا گلاس انڈیل سکتا تھا لیکن حوض میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔رات ہوئی شہر کے کونے کونے سے لوگ بھرا ہوا گلاس لاتے اور اس حوض میں انڈیل دیتے،لیکن ہوا یہ کہ ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ سارے شہر کے لوگ تو دودھ ڈال رہے ہیں میں اکیلا اگر پانی سے بھرا گلاس ڈال دیتا ہوں تو کیا ہوگا اتنے سارے دودھ میں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ میں نے دودھ نہیں پانی ڈالا ہے۔اسی سوچ کے ساتھ ہر شخص پانی سے بھرا گلاس ڈالتا گیا۔ دوسرے دن علی الصبح جب بادشاہ اپنے وزیرِ خاص اور دیگر سپاہیوں کے ساتھ تشریف لایا تو کیا دیکھتا ہے کہ پورا حوض پانی سے بھرا ہوا ہے دودھ ایک بوند بھی نہیں ہے۔ بیٹے خالد اس کہانی سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہر شخص اگر ماحولیاتی آلودگی سے متعلق یہ سوچتا ہے کہ میرے اکیلے کے عمل کرنے سے کیا ہوگا تو نتیجہ وہی ہوگا جو ہم نے کہانی میں دیکھا اور نقصان بھی سب کو ہوگا۔ لیکن اگر ہم میں کا ہر شخص ماحولیاتی آلودگی سے متعلق سنجیدگی سے غور کرے گا عمل کرے گا،تو حوض دودھ سے بھر جائے گا۔مطلب یہ ہے کہ سبھی کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔اسی لیے بیٹا ہر شخص کو ماحولیاتی آلودگی سے متعلق سنجیدہ ہو جانا چاہیے اور یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ میرے اکیلے کے عمل کرنے سے کیا ہوگا بلکہ اپنی بساط بھر کوشش کرنی چاہیے اس کے تعلق سے بیداری مہم چلانی چاہیے۔میں ان باتوں پر عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ کہتے ہوئے خالد اپنی جگہ سے اٹھا ہی تھا کہ پیریڈ کا گھنٹہ بج گیا۔

اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں ماحولیاتی آلودگی کے سلسلے میں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ کھانے پینے میں بھی وہی چیز استعمال کرنی چاہیے جو ہماری صحت کے لیے بہتر ہو۔

■

Yasmeen Bano
Akbari Chowk, Biyabani
infront of Akbari Medical
Achalpur - 444806 (Maharashtra)
Mob.: 9370090295
yasmeenachalpur@gmail.com

عاطف عدنان شیخ صادق

کہانی

ندی کا راز

صبح کی ٹھنڈی ہوا نرم نرم جھونکوں کی صورت ندی کے پانی کو چھو رہی تھی۔ سورج افق سے جھانک رہا تھا، اور آسمان ہلکے نارنجی اور گلابی رنگوں میں رنگا ہوا تھا۔ پرندوں کی مدھم چہکار، درختوں کی ہلکی سرسراہٹ اور ندی کے بہتے پانی کی سرگوشی مل کر ایک ایسا منظر بُن رہی تھی، جیسے قدرت خود جاگ رہی ہو۔

ندی کے کنارے ایک چھوٹی سی مٹی اور لکڑی کی جھونپڑی تھی۔ اسی جھونپڑی میں ایک سادہ دل، محنتی اور درویش صفت مچھیرا رہتا تھا۔ اس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ چہرے پر وقت کی دھوپ چھاؤں سے بنی لکیریں تھیں، مگر آنکھوں میں سکون اور دل میں قناعت کا نور جھلکتا تھا۔

کلیم کی بیوی کئی سال پہلے دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ اس کا غم ابھی دل میں تازہ تھا، مگر اس نے صبر کی چادر اوڑھ لی تھی۔ اس کی ایک بیٹی تھی زہرہ — معصوم، ذہین، اور خوبصورت بچی، جو ندی کے پانی کی طرح صاف دل رکھتی تھی۔

کلیم روزانہ سورج نکلنے سے پہلے اپنی پرانی مگر مضبوط کشتی لے کر ندی میں اترتا۔ وہ مچھلیاں پکڑتا، اور شام کو واپس آ کر اپنی بیٹی کے ساتھ دن بھر کی روداد بانٹتا۔ زہرہ جب چھوٹی تھی، کلیم اسے ندی کے کنارے بیٹھا کر کہانیاں سناتا — جن میں کبھی پرندوں کی دوستی ہوتی، کبھی ندی کی پری، اور کبھی نیکی کرنے والوں کو ملنے والی ان دیکھی نعمتیں۔

ایک دن کلیم نے زہرہ سے کہا:

''بیٹی، یہ ندی صرف پانی نہیں ہے۔ یہ ایک راز ہے، ایک سبق ہے۔ جیسے زندگی بہتی ہے، ویسے ہی یہ ندی بہتی ہے۔ اگر اس کی قدر کرو، تو یہ تمھیں بہت کچھ سکھا سکتی ہے۔''

زہرہ اس بات کو سنجیدگی سے سنتی، اور دل میں محفوظ کر لیتی۔

وقت گزرتا گیا۔ ایک دن ایسا آیا کہ کلیم نے محسوس کیا کہ ندی بدل رہی ہے۔ وہ دن جو کبھی مچھلیوں سے

بھرپور ہوتے تھے، اب خالی جا رہے تھے۔ کئی دن کی محنت کے باوجود کلیم خالی ہاتھ واپس لوٹا۔ ندی جیسے خاموش ہو چکی تھی، اس کی روانی میں وہ پہلے جیسا ساز نہیں رہا تھا۔

کلیم پریشان ہوا۔ گاؤں کے دوسرے مچھیروں نے بھی یہی شکایت کی۔ کوئی کہتا شاید پانی آلودہ ہو گیا ہے، کوئی کہتا کہ شاید قدرت ناراض ہے۔ کلیم نے دل میں طے کیا کہ وہ ندی کے مزید اندر جائے گا، شاید اس راز کا کوئی جواب مل جائے۔

اگلی صبح، وہ بہت جلد ندی کی طرف گیا۔ کشتی کو آہستگی سے ندی کے بیچوں بیچ لے گیا۔ سورج کی روشنی پانی پر پڑ رہی تھی، اور اچانک کلیم کی نظر ایک چمکتی ہوئی چیز پر پڑی، جو پانی کے نیچے تھی۔

کلیم نے کشتی روکی، پانی میں ہاتھ ڈالا، اور احتیاط سے اس شے کو نکالا۔ یہ ایک چھوٹا سا دھاتی صندوق تھا۔ کلیم نے اسے کشتی میں رکھا، کپڑے سے صاف کیا، اور ڈھکن کھولا۔ اندر چند پرانی اشرفیاں تھیں، ایک خط اور ایک لکڑی پر بنا ہوا پرانا سا نقشہ۔

کلیم نے خط نکال کر پڑھا۔ اس پر لکھا تھا:

''اے ندی کے مسافر! یہ دولت تمھارے لیے نہیں، بلکہ ان لوگوں کے لیے ہے جن کے دل صاف اور ارادے نیک ہوں۔ اگر تم خود کے لیے لو گے، تو یہ مٹی بن جائے گی۔ مگر اگر تم اسے گاؤں کی بھلائی کے لیے خرچ کرو گے، تو یہ نعمت بڑھے گی۔ ندی تمھیں آزما رہی ہے۔''

کلیم کا دل دھڑکنے لگا۔ سالوں کی محنت، غربت، اکیلا پن — سب ایک طرف، اور یہ غیر متوقع خزانہ ایک طرف۔ اگر وہ چاہتا، تو یہ اشرفیاں بیچ کر اپنی اور زہرہ کی زندگی بدل سکتا تھا۔ نیا گھر، بہتر کپڑے، اور شاید زہرہ کو شہر کی تعلیم بھی دلوا سکتا تھا۔

مگر جیسے ہی اس نے زہرہ کا معصوم چہرہ یاد کیا، اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر اسے ندی کا پاکیزہ بہاؤ یاد آیا — وہ پانی جو کبھی اس کے خالی جال کو بھی تسلی دیتا تھا۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ یہ دولت امانت ہے۔

اسی شام، کلیم گاؤں کے بزرگوں کے پاس گیا۔ صندوق، خط اور نقشہ سب ان کے سامنے رکھ دیے۔ گاؤں کے لوگ حیران رہ گئے۔ کچھ لوگوں نے کہا، ''ہم سب مل کر بانٹ لیتے ہیں''، مگر کلیم نے نرمی سے کہا:

''یہ دولت بانٹنے کے لیے نہیں، سنوارنے کے لیے ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ گاؤں میں ایک اسکول بنے، ندی کی صفائی کا مستقل انتظام ہو، اور ایک مچھلی منڈی قائم کی جائے جہاں ہر غریب کو روزگار ملے۔''

بزرگوں نے سر ہلایا، اور یوں فیصلہ ہو گیا۔

آنے والے مہینوں میں گاؤں کی تقدیر بدلنے لگی۔ اسکول کی بنیاد پڑی، بچے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ندی کے کنارے صفائی کی مہم چلی، لوگ اس کے قریب گندگی پھینکنے سے باز آنے لگے۔ مچھلی منڈی بننے سے کلیم جیسے کئی محنت کشوں کو بہتر دام ملنے لگے۔

زہرہ اب بڑی ہو چکی تھی۔ تعلیم کا شوق اس کے دل میں کلیم نے ہی ڈالا تھا۔ وہ شہر گئی، اور ماحولیات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ گاؤں لوٹی — مگر اس بار صرف کلیم کی بیٹی بن کر نہیں، بلکہ گاؤں کی خدمت گار بن کر۔

زہرہ نے گاؤں میں ایک 'ماحولیاتی مرکز' قائم کیا۔ وہاں بچوں کو ندی، درختوں، پرندوں، اور زمین کی اہمیت سکھائی جاتی۔ وہ کہتی:

''اگر ہم قدرت سے محبت کریں، تو وہ ہمیں کبھی خالی ہاتھ نہیں چھوڑتی۔''

ایک شام، زہرہ ندی کے کنارے بیٹھی تھی۔ کلیم اب بوڑھا ہو چکا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں اب بھی وہی چمک تھی جو پہلے دن ندی کے راز کو سنبھالتے وقت تھی۔

زہرہ نے نرمی سے پوچھا:

''بابا، کیا ندی کا راز اب بھی وہی ہے؟''

کلیم نے مسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا، ندی کی لہروں پر نظر ڈالی، اور آہستہ سے کہا:

''اب تو راز تم نے کھول دیے، بیٹی۔ اب تم ندی کی نگہبان ہو۔ ندی صرف پانی نہیں... یہ اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہے۔ جو اسے سمجھے، وہی دنیا کا سچا امیر ہے۔''

ندی اب صرف ایک جغرافیائی چیز نہیں رہی تھی۔ وہ ایک استعارہ بن چکی تھی — سخاوت، قربانی، قناعت اور فطرت کی حفاظت کا۔ کلیم کی کہانی ہر بچے کی زبان پر تھی، اور زہرہ کی لگن ہر دل میں روشنی جگا رہی تھی۔

ندی اب بھی بہتی تھی — خاموشی سے، مگر زندگی بانٹتی ہوئی۔

یہ کہانی ہمیں سکھاتی ہے کہ حقیقی دولت صرف سونے چاندی میں نہیں، بلکہ ہمارے فیصلوں، ارادوں اور جذبوں میں ہے۔ آزمائش کسی بھی شکل میں آسکتی ہے — کبھی خزانے کی صورت، کبھی غربت کی شکل میں۔ مگر جو دل کے صاف، نیت کے سچے اور دوسروں کی بھلائی کے لیے جیتے ہیں، وہی اصل کامیاب ہیں۔

ندی کے پانی کی طرح ہمیں بھی بہنا ہے — مگر بامقصد۔ دوسروں کو سیراب کرنا، خود کو پاکیزہ رکھنا، اور آزمائش میں ثابت قدم رہنا ہی دوسروں کے کام میں خلل نہ دے اور نہ ہی دوسروں سے حسد کرے ہو سکے تو دوسروں کی مدد ضرور کریں اصل راز یہی ہے، ندی کا راز!

■

Atif Adnan Shaikh Sadiq
Shahu Nagar, Shaheen Library
Jalgaon- 425001 (Maharashtra)
atifadnan900@gmail.com

جواب

1	ممبئی پورٹ ٹرسٹ	2	10 اکتوبر	3	کویتی دینار	4	اوزمیئم (Osmium)
5	دی بون میرو	6	مائیکل فلپس۔28 میڈل	7	گردہ	8	مولانا حسرت موہانی
9	ہائپرٹیکسٹ ٹرانسفر پروٹوکول	10	Quick Response code	11	گریوی میٹر	12	نیشنل ہائی وے 44
13	سبسکرائبر آئی ڈینٹیفائی ماڈیول	14	نظم	15	تمل ناڈو	16	پنجاب کے علاقے میں
17	امرتسر	18	پٹنہ	19	نائٹروجن	20	نیویارک

احرار حسین

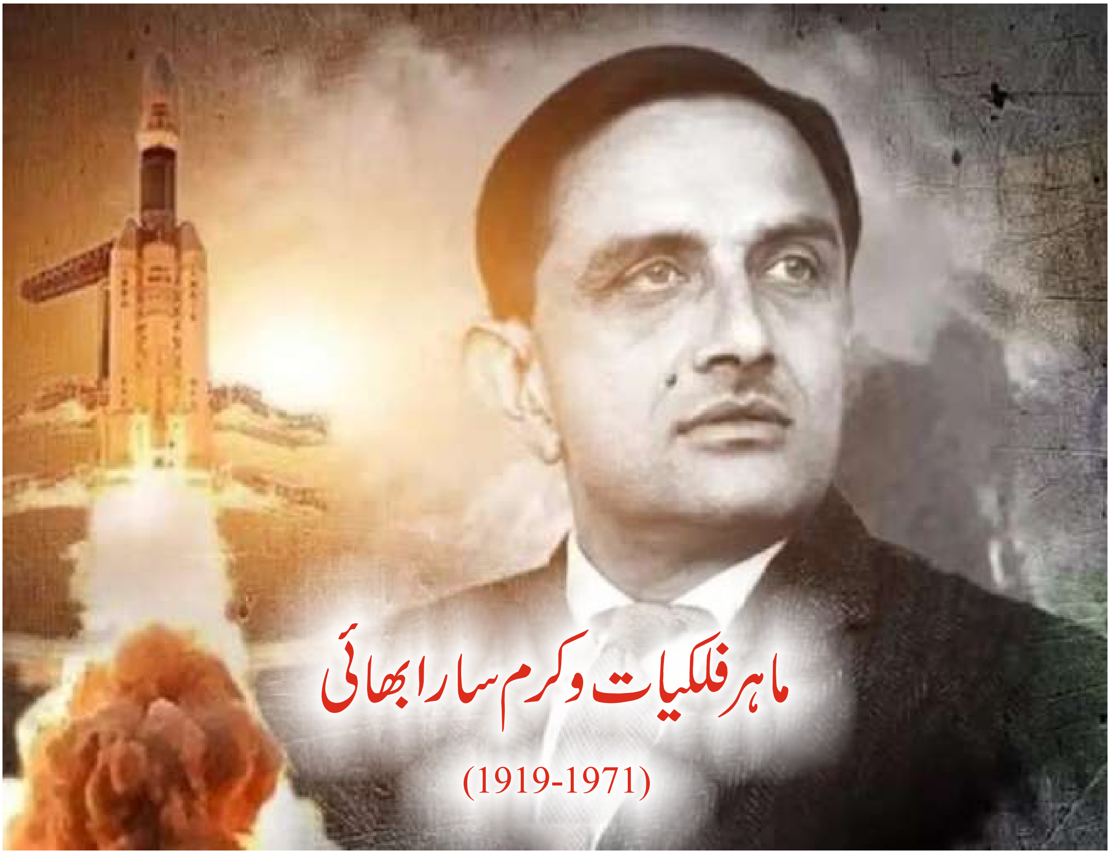

ماہر فلکیات وکرم سارا بھائی

(1919-1971)

وکرم سارا بھائی (Vikram Sarabhai) کی پیدائش احمد آباد میں 1919 کو ہوئی۔ ان کے والد صاحب کا نام امبالال سارا بھائی تھا۔ وہ ایک بڑے کارخانے کے مالک تھے اور دولت مند شخص تھے۔ آپ کے والد صاحب نے وکرم سارا بھائی کی تعلیم کی غرض سے اپنے گھر میں اسکول کھولا۔ اس اسکول میں قابل اساتذہ کا انتظام کیا۔ اسکول کے تعلیمی نصاب میں بنیادی سائنس، جغرافیہ، حساب، تاریخ، انجینئر نگ اور ڈرائنگ جیسے مضامین کو شامل کیا۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب اسکول میں آٹھ بچوں کو پڑھانے کے لیے سولہ استاد موجود تھے، ان میں چار استاد پی ایچ ڈی بھی تھے۔ اس سے ان کی تعلیم کے بارے میں دلچسپی اور معیار کا پتہ چلتا ہے۔ اسی اسکول میں وکرم سارا بھائی کو خود اپنے ہاتھ سے سارے کاموں کے کرنے کی ٹریننگ دی گئی۔ اسی اسکول میں وکرم سارا بھائی کو اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملا۔ اس اسکول کے طور طریقوں اور نصاب کا وکرم سارا بھائی کی زندگی پر ایک خاص اثر پڑا۔ میٹرک پاس کر لینے کے بعد سارا بھائی نے گجرات یونیورسٹی احمد آباد میں داخلہ لیا یہاں سے انٹر سائنس کا امتحان پاس کر لینے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں انھوں نے سینٹ جان کالج کیمبرج میں 1939 میں فزکس اور حساب میں بی ایس سی کی ڈگری

حاصل کی۔ انگلینڈ کے قیام کے دوران انھوں نے کچھ تحقیقی کام بھی کیے۔لیکن دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے وہ ہندوستان واپس آگئے۔ ہندوستان آکرانھوں نے انڈین سائنس انسٹی ٹیوٹ بنگلور میں کلمک شعاعوں پر تحقیقی کام شروع کیا۔مشہور سائنس داں ڈاکٹر وینکٹ رمن ان کے ڈائرکٹر تھے۔

انڈین سائنس انسٹی ٹیوٹ بنگلور میں وکرم سارا بھائی کی ملاقات ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا سے ہوئی۔ ہومی بھابھا کا تحقیقی کام کلمک شعاعوں پر ہی تھا۔ وکرم سارابھائی کو بھابھا کی قیادت میں کلمک شعاعوں پر تحقیق کرنے کا موقع ملا۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر وکرم سارابھائی پھر انگلینڈ چلے گئے اور وہاں کلمک شعاعوں پر اپنی تحقیق کو آگے بڑھایا۔ 1947 میں کیمبرج یونیورسٹی نے وکرم سارابھائی کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا۔اسی سال وہ انگلینڈ سے ہندوستان تشریف لے آئے اور پروفیسر کی حیثیت سے احمد آباد میں کام کرنے لگے۔وکرم سارابھائی ہر وقت سائنسی فروغ کے لیے ہمہ تن مصروف رہتے۔ وہ اپنی دھن کے پکے تھے۔ سارے آرام و آسائش کے سامان۔موجود ہونے کے باوجود وہ آرام کرنا نہیں جانتے تھے۔ سارابھائی ہندوستان کے وہ پہلے سائنس داں تھے جنھوں نے فلکی تحقیقات کا کام شروع کیا۔ اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن (Space Research Organisation) کے صدر منتخب ہوتے ہی انھوں نے تریویندرم سے دس کلومیٹر دور تھمبا میں راکٹ لانچنگ اسٹیشن (Thumba Rocket Launching Station) کی بنیاد رکھی۔ سری ہری کوٹا میں قومی فلکی اڈا اور احمد آباد میں مواصلاتی مرکز کی بنیاد بھی رکھی۔ ڈاکٹر سارابھائی نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ایٹمی توانائی کا استعمال پر امن اور انسان ترقی کے کاموں کے لیے ہونا چاہیے۔ سارابھائی نے صنعتی ترقی کے میدان میں بھی اپنی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا۔ آپ ہندستانی تعلیم میں سدھار لانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے اور احمد آباد کے تعلیمی اداروں سے ہمیشہ منسلک رہے۔ نیشنل سائنس اکیڈمی کا سنگ بنیاد رکھنے میں بھی آپ شامل تھے۔

ڈاکٹر سارابھائی کا کہنا تھا کہ پوری تعلیم ہی تحقیق پر منحصر ہو۔ بچوں میں جاننے اور سوالات کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ ان میں نئی نئی تحقیقی قوت پیدا کرنے کی خواہش پیدا ہو۔ آپ مہاتما گاندھی کی بنیادی تعلیم کے طریقوں کو عمل میں لانا چاہتے تھے۔ آپ کا کہنا تھا کہ قدرت اور ماحول کی، تجربہ گاہوں میں تعلیم دی جائے، اپنی ان خوبیوں کی وجہ سے وکرم سارابھائی ملک اور بیرونی ممالک سے منسلک رہے اور کئی بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ آپ کے کام کرنے کا میدان سائنس تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ تعلیمی صنعت گیری اور تجارت میں بھی آپ دلچسپی رکھتے تھے۔

30 دسمبر 1971 کو آپ کی موت واقع ہوگئی۔ آج ہمارا ملک سائنس کے ہر شعبے میں ترقی کر رہا ہے اور خود کفیل ہے اس میں ڈاکٹر وکرم سارابھائی کی کوششیں بھی شامل ہیں۔

■

ماخذ: عظیم سائنس داں، **مصنف:** احرار حسین، **تیسری طباعت:** 2016، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

تاریخی، سائنسی اور ثقافتی معلومات

معلوماتِ عامہ بچوں کے کیریئر اور مستقبل سازی کے لیے بہت ضروری ہے۔ جنرل نالج پوری دنیا سے جوڑنے کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اسی کے ذریعے مسابقہ جاتی امتحانات میں کامیابی کے دروازے کھلتے ہیں، اس لیے بچے اگر ابھی سے تاریخ، ادب وثقافت، سماج اور سائنس کے موضوعات اور معلومات پر اپنی توجہ مرکوز کریں تو مستقبل میں ان کے لیے راہیں آسان ہوجائیں گی۔

1. ہندوستان کی سب سے بڑی بندرگاہ کا نام بتائیں؟
2. قومی ڈاک دن کب منایا جاتا ہے؟
3. دنیا کی سب سے بڑی کرنسی کون سی ہے؟
4. دنیا کی سب سے بھاری دھات کا نام کیا ہے؟
5. جسم میں خون بنانے والا عضو کون سا ہے؟
6. سب سے زیادہ اولمپک میڈل کس ایتھلٹ نے جیتا ہے؟
7. انسانی جسم میں خون کو صاف کرنے والا عضو کون سا ہے؟
8. انقلاب زندہ باد کا نعرہ کس نے دیا تھا؟
9. HTTP کا فل فارم کیا ہے؟
10. QR Code کا فل فارم کیا ہے؟
11. وہ کون سا آلہ ہے جو زمین کی کشش ثقل کے اثرات کو ناپتا ہے؟
12. ہندوستان کے سب سے لمبے ہائی وے کا نام کیا ہے؟
13. SIM کا فل فارم کیا ہے؟
14. Poem کو اردو میں کیا کہتے ہیں؟
15. بھارت ناٹیم کا تعلق ہندوستان کی کس ریاست سے ہے؟
16. بیساکھی کا تہوار ہندوستان کے کس علاقے میں منایا جاتا ہے؟
17. جلیانوالہ باغ کا سانحہ کس شہر میں پیش آیا؟
18. گول گھر کس شہر میں واقع ہے؟
19. ہوائی جہاز کے ٹائروں میں کس گیس کا استعمال ہوتا ہے؟
20. یونیسیف کا ہیڈکوارٹر کہاں واقع ہے؟

(جواب صفحہ نمبر 55 پر ملاحظہ فرمائیں)

چمن چمن کے پھول

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے تحریر و تقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، خطاب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقعے کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔

'چمن چمن کے پھول' میں مختلف رنگ اور شاعروں کے شعر اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ بچے موضوع کی مناسبت سے اچھے اشعار یاد کریں اور اپنی تحریر و تقریر میں اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال کرسکیں۔ (ادارہ)

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ سب کو
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں
—اکبرالہ آبادی

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی
گرداب کی ہر تہہ میں ساحل نظر آتا ہے
—فانی بدایونی

اتنے مایوس تو حالات نہیں
لوگ کس واسطے گھبرائے ہیں
—جاں نثار اختر

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا
—محشر بدایونی

سیاہ رات نہیں لیتی نام ڈھلنے کا
یہی تو وقت ہے سورج ترے نکلنے کا
—شہریار

لوگ جس حال میں مرنے کی دعا کرتے ہیں
میں نے اس حال میں جینے کی قسم کھائی ہے
—امیر قزلباش

یقین ہو تو کوئی راستہ نکلتا ہے
ہوا کی اوٹ بھی لے کر چراغ جلتا ہے
—منظور ہاشمی

میرے ٹوٹے حوصلے کے پر نکلتے دیکھ کر
اس نے دیواروں کو اپنی اور اونچا کر دیا
—عادل منصوری

شہر کے اندھیرے کو اک چراغ کافی ہے
سو چراغ جلتے ہیں اک چراغ جلنے سے
—احتشام اختر

واقف کہاں زمانہ ہماری اڑان سے
وہ اور تھے جو ہار گئے آسمان سے
—فہیم جوگاپوری

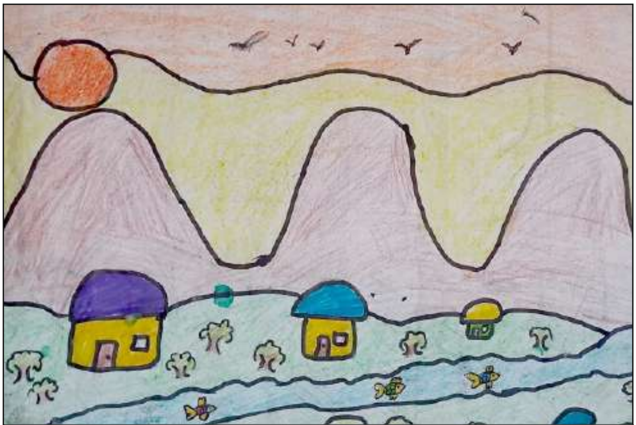

شیخ مہران محمد، درجہ چہارم، مینار اردو پرائمری اسکول، پٹیل نگر، لاتور، مہاراشٹر

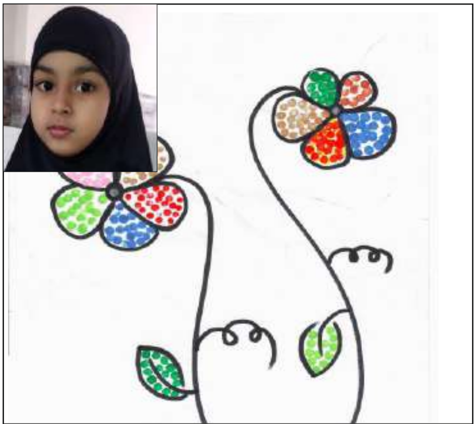

بریرہ، درجہ چہارم، بلوہلز نفیس روڈ، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

حفصہ بنت محمد شاہ نواز حیدر، درجہ دوم
مدرسہ فیضان رحیمی، مرزاپور، سہارنپور، یوپی

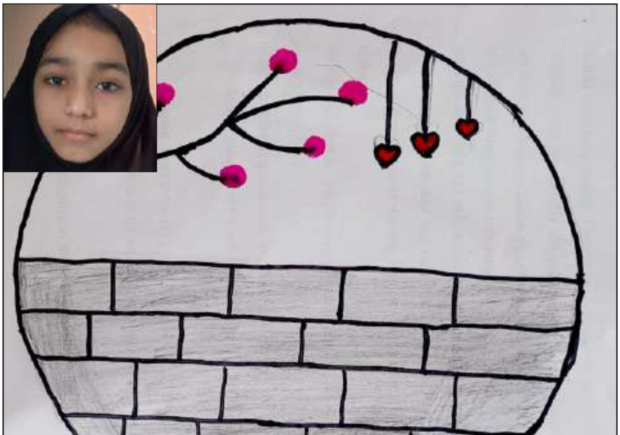

باغوان ماہرہ مزمل، درجہ چہارم، مینار اردو پرائمری اسکول، پٹیل نگر، لاتور، مہاراشٹر

جویریہ شیخ ذاکر، درجہ پنجم الف، آکسفورڈ انگلش اسکول، سلوڑ اورنگ آباد مہاراشٹر

حبشی طاہرہ بانو، درجہ چہارم، شاہین پبلک سیکنڈری اسکول
لال پول، جالور، راجستھان

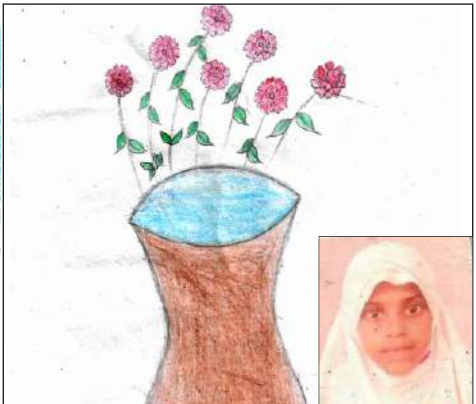

زینت بانو اختر شیخ، درجہ ششم (ب)، بھیونڈی نظام پور شہر میونسپل کارپوریشن، اسکول نمبر 6، ضلع تھانہ، مہاراشٹر

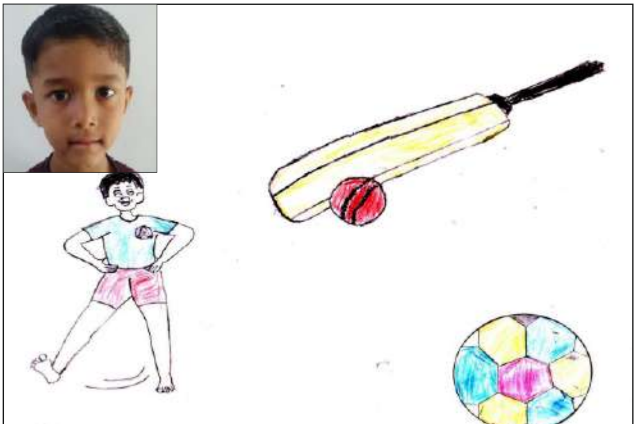

ایان احمد ریاض، درجہ اوّل، ضلع پریشد اردو اسکول، تھالنیر، ضلع دھولیہ

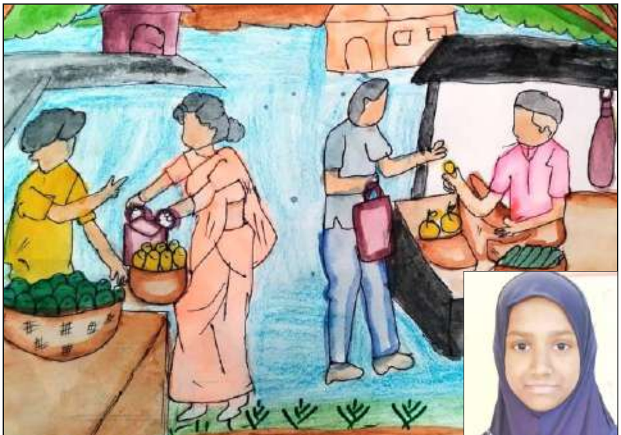

فاطمہ اسرار باغبان (ہفتم: الف)، ملت ہائی اسکول، مہرون، جلگاؤں، مہاراشٹر

شافیہ شیخ عرفان (ہفتم: الف)، ملت ہائی اسکول مہرون، جلگاؤں، مہاراشٹر

حلیمہ سعدیہ محمد عاصم، درجہ دوم، سولیس ماڈل پرائمری اسکول مالیگاؤں، مہاراشٹر

ثانیہ بی سراج شاہ، درجہ ششم گورنمنٹ اردو نیو ماڈل اسکول، شاہ پور، ضلع برہانپور، ایم پی

حمیرہ ایوب پنجاری (ہفتم:الف)، ملت ہائی اسکول، مہرون، جلگاؤں، مہاراشٹر

شفاء بی سید عثمان، کاروان علم مکتب (نمبر تین) شاہپور
ضلع برہانپوری، ایم پی

فرزانہ خاتون محمد حسین، درجہ ششم (ب)، بھیونڈی نظام پور شہر
میونسپل کارپوریشن، اسکول نمبر 6، ضلع تھانہ، مہاراشٹر

محمد زین ظہیر عباس، باگیواڑی، درجہ چہارم، سرکاری اردو، مدرسہ نمبر 2، بیل ہونگل، کرناٹک

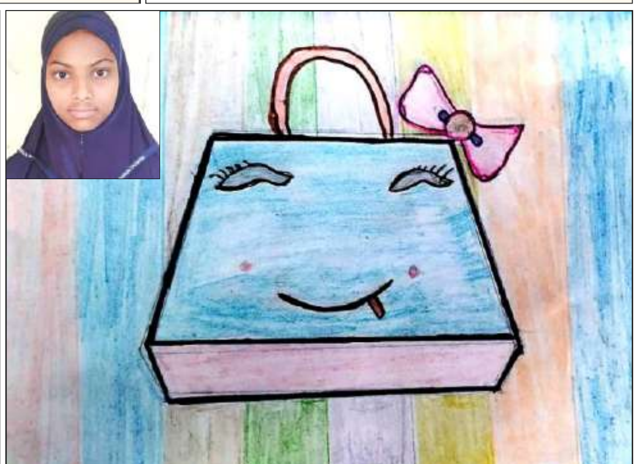

تنزیلہ بانو عثمان شاہ (ہفتم:الف)، ملت ہائی اسکول، مہرون، جلگاؤں، مہاراشٹر

ام ہانی بنت سلمان قریشی، مولانا آزاد ایجوکیشنل اکیڈمی شاہ پور
ضلع برہانپور، ایم پی

قلمکاروں سے چند باتیں

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ایک مقبول رسالہ ہے جس میں بچوں کے ذہن اور نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں، پیاری پیاری نظمیں اور دیگر مفید تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہندوستان کی نمائندگی ہو مگر بسیار کوشش کے باوجود بہت سے علاقوں کی متناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسے علاقوں کے ادیبوں کی جستجو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہے۔

قلمکاروں سے گذارش ھے که بچوں کی دنیا کے لیے تحریریں بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھیں:

- بچوں کے لیے صرف وہی تخلیق ارسال کریں جس سے ان کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر وہ تحریریں جو بچوں میں مطالعے کی تحریک اور ترغیب پیدا کریں۔
- تخلیق کی زبان آسان ہو، مشکل الفاظ سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔
- تخلیق غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلّے میں ارسال نہ کی گئی ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 1200 (بارہ سو) الفاظ سے کم اور 2000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون کے ساتھ اپنا تعارف مع تصویر ارسال فرمائیں۔ تعارف میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اندراج ضرور فرمائیں۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- تخلیق کی اشاعت کے درمیان کم سے کم تین (3) ماہ کا فاصلہ لازمی ہے۔ اس سے کم مدت میں تخلیق کی اشاعت کے لیے اصرار نہ فرمائیں۔
- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو زیادہ مفید مطلب بنانے کے لیے آپ سب کے مشوروں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

—ادارہ

बच्चों की दुनिया मासिक, अक्टूबर 2025, वर्ष 13, अंक 10
BACHON KI DUNIYA Monthly, October 2025 Vol. 13, Issue: 10
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/09/2025
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

صفحات: 47 قیمت: 25 روپے

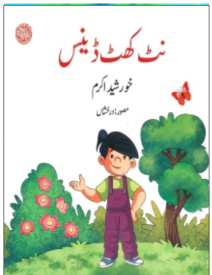

صفحات: 30 ، قیمت: 40 روپے

صفحات: 28، قیمت: 35 روپے

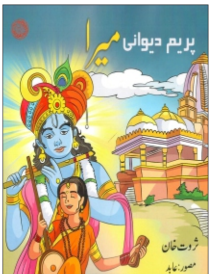

صفحات: 17، قیمت: 25 روپے

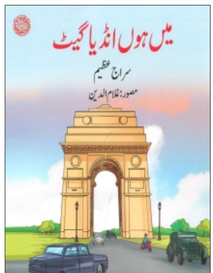

صفحات: 30، قیمت: 40 روپے

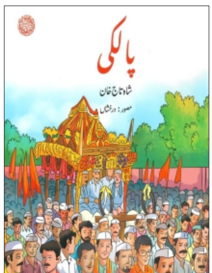

صفحات: 33، قیمت: 40 روپے

صفحات: 20، قیمت: 30 روپے

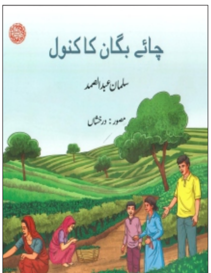

صفحات: 33، قیمت: 40 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B - 127, Sector 65, Noida, U.P
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.